خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

الفتح

ہفت روزہ — کراچی

جلد — ۳ ، شمارہ — ۲۰

۲۸ ستمبر — ۵ اکتوبر ۱۹۷۲ء

نگران

شوکت صدیقی

مدیر

ارشاد راؤ

نائب مدیر

وہاب صدیقی

* * * *

اشاعتِ خاص

قیمت — ایک روپیہ پچیس پیسے

ہوائی ڈاک سے۔ ایک روپیہ پچاس پیسے

مقام اشاعت

ہفت روزہ الفتح، ۸۰ ڈی نرسری کمرشل ایریا

پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس۔ کراچی، ۲۹

ایڈیٹر پبلشر:- ارشاد راؤ

مطبع حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد کراچی

ٹیلیفون :- ۴۱۲۲۷۴

فہرست اشاعتِ خاص

(اکتوبر ۱۹۷۲ء)

پیپلز پارٹی ـــ دایاں اور بایاں بازو

پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت کو نو مہینے مکمل ہو گئے ہیں۔ صدر بھٹو نے تاریخ پاکستان کے شدید ترین بحران کے دوران عنانِ حکومت سنبھالی۔ اس وقت ملک کا اکثریتی صوبہ مشرقی پاکستان بھارتی افواج کے قبضے میں جا چکا تھا۔ ہماری مسلح افواج نے مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈال دیئے تھے، اور انہیں دشمن نے قیدی بنا لیا تھا۔ بھارت اور روس بنگلہ دیش کے قیام میں کامیاب ہو چکے تھے اور اس طرح ایک نوزائیدہ مملکت معرضِ وجود میں آچکی تھی۔

مغربی پاکستان میں بھارتی فوجیں سندھ میں کافی اندر گھس چکی تھیں۔ شکر گڑھ سیکٹر اور کارگل کے محاذ پر بھی بھارت کا پلّہ بھاری تھا۔ تقریباً ۵ ہزار مربع میل سرزمینِ پاک پر بھارتی افواج قابض تھیں۔ پاکستان، روس اور بھارت سے مقابلے میں ۱۹۷۱ء کی جنگ نہ صرف ہار چکا تھا بلکہ مشرقی پاکستان سے محروم بھی ہو چکا تھا اور مغربی سرحدوں پر وہ دشمن کے رحم و کرم پر تھا۔

بین الاقوامی سطح پر پاکستان برطانیہ کی بنگلہ دیش نوازی کی وجہ سے دولتِ مشترکہ سے الگ ہو گیا۔ امریکہ نے بھی بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیا۔ فرانس نے بھی اپنا فیصلہ بنگلہ دیش کی حمایت میں دیا۔ روس اور اُس کے اتحادی، بھارت اور بنگلہ دیش کے شانہ بشانہ صف آرا ہو گئے۔ عوامی جمہوریہ چین واحد بڑی طاقت ہے۔ جس نے پاکستان کی اصولوں کی بنیاد پر حمایت کی۔ عظیم چین نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ روسی اور بھارتی جارحیت کی بھرپور مذمت کی اور اُسے پنج شیلا کے اصولوں کی خلاف ورزی قرار دیا۔ عرب ممالک بالخصوص لیبیا، مصر اور الجزائر نے کھل کر پاکستان کے مؤقف کی تائید کی اور اس طرح بین الاقوامی سطح پر چین اور عرب ممالک نے پاکستان کو سہارا دیا۔

اِن حالات میں صدر بھٹو کو بین الاقوامی سطح پر جو سنگین مسائل ورثے میں ملے ہیں، اُن میں سے یہ اہم ہیں۔

• جنگی قیدیوں کی واپسی • سرحدوں سے فوجوں کا انخلاء اور بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ • روس اور بھارت سے تعلقات کا مسئلہ • تنازعہِ کشمیر۔

صدرِ مملکت نے ان مسائل کے حل کے لئے مقدور بھر ذرائع سے کام لیا۔ اس کے نتیجے میں شملہ میں صدر بھٹو اور وزیرِ اعظم اندرا گاندھی کے مابین مذاکرات ہوئے۔ شملہ سمجھوتے کا اعلان ہو گیا اور یہ توقع پیدا ہوئی کہ پاکستان اور بھارت برِ صغیر میں قیامِ امن کی کوششوں میں کسی حد تک کامیاب ہو جائیں گے۔

شملہ معاہدہ کے باوجود تادمِ تحریر بین الاقوامی مسائل جوں کے توں ہیں۔ اِس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ صدر بھٹو جب بھارت گئے تو وزیرِ اعظم اندرا گاندھی اور بھارتی حکومت کو یہ علم تھا کہ انہیں مغربی پاکستان میں قومی اسمبلی کے تمام ارکان اور جماعتوں کا مکمل اعتماد حاصل ہے اور وہ مغربی پاکستان کے غیر متنازعہ لیڈر ہیں۔ لیکن شملہ سے واپسی کے بعد حزبِ اختلاف نے یہ بھرم نہ رہنے دیا اور اختلافات کو خوب ہوا دی۔ اِس پر بھارتی حکام نے اپنا مؤقف بدل دیا۔

شملہ معاہدہ سے حزبِ اختلاف کی بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ نیپ اسے اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتی تھی۔ جب کہ باقی جماعتیں اس کے ردِ عمل سے اپنے اقتدار کا راستہ ہموار کرنے میں مصروف تھیں۔ ہر چند کہ یہ سمجھوتہ مجموعی طور پر حزبِ اختلاف کے عزائم پورے نہ کر پایا۔ مگر انہوں نے بے چینی او

بدامنی پھیلانے کے لئے دوسرے طریقے استعمال کرنا شروع کر دیئے۔ سندھ میں لسانی فسادات اس سلسلے کا اہم ترین حصہ ثابت ہوئے۔ نوکر شاہی نے اپنا کردار ادا کیا۔ وہ مزدوروں اور کسانوں کے خلاف صف آرا ہو گئی اور اس طرح بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہونے لگا۔ ولی خان اور اس قبیل کے دوسرے لیڈروں نے بیانات کے دفاتر کھول دیئے اور ثابت یہ کیا جانے لگا کہ مغربی پاکستان زبردست انتشار کا شکار ہے۔

شیخ مجیب الرحمان کی لندن میں علالت نے حزب اختلاف کے رہنماؤں کی قلعی کھول کر رکھ دی۔ ولی خان علاج کے لئے لندن پہنچ گئے۔ ملک غلام جیلانی کے پیٹ میں درد اٹھا، وہ بھی لندن روانہ ہو گئے۔ عطاء اللہ مینگل نے بھی یہی راستہ پسند کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے لندن پاکستانی سیاست دانوں کے ہسپتال میں منتقل ہو گیا۔

بھارت نے پاکستان کے سیاسی مد و جزر کا بغور مطالعہ کیا۔ اُس نے دیکھا کہ ابھی حالات ایسے ہیں کہ پاکستان کو مزید نیچا دکھایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا حسب سابق بھارتی حکمرانوں نے معاہدہ شملہ کو طاق میں سجا کر رکھ دیا۔ سرحدوں سے فوجوں کی واپسی کا مسئلہ کھٹائی میں پڑنے لگا اور دوسرے امور دھرے کے دھرے رہ گئے۔

قوم پرست حزب اختلاف کے فقدان نے قومی مسائل کو مزید الجھا دیا ہے۔ اس کمی نے پاک بھارت سیاست کا پانسہ پلٹ کر رکھ دیا۔ بھارت کو احساس ہو گیا کہ اتنی بڑی شکست کا سامنا کرنے والی قوم کے جذبات سے کھیلنے والے لوگ موجود ہیں جو مغربی پاکستان میں علیحدگی یا عصبیت کی تحریک چلانے کے لئے راہیں ہموار کر رہے ہیں۔ بھارت جس نے مغربی پاکستان کو ختم کرنے کا پروگرام فی الحال ملتوی کر دیا تھا۔ یہ حالات دیکھ کر بدل گیا اور اب شاید اپنے پرانے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی فکر میں ہے جس کا مقصد یقیناً پاکستان کو اکھنڈ بھارت کا حصہ بنانا ہو گا۔

ان تمام حالات کی ذمہ داری صرف حزبِ اختلاف پر عائد نہیں کی جا سکتی، حزبِ اقتدار نے اپنی غلط پالیسیوں اور ناقص حکمت عملی کی وجہ سے حزب اختلاف کو کھل کھیلنے کے زیادہ مواقع فراہم کئے ہیں۔ بعض اوقات تو عام آدمی یہ تک کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ سب کچھ حکومت کروا رہی ہے۔ اس شبے کی گنجائش اس لئے پیدا ہوئی کہ پیپلز پارٹی نے اپنا کام پولیس اور نوکر شاہی کے حوالے کر دیا۔ سیاسی عمل کی جگہ نوکر شاہی نے لے لی اور ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے پیپلز پارٹی کا وجود کاغذوں اور وزیروں تک محدود ہو کر رہ گیا۔ پولیس نے ظاہر ہے، اپنے طور طریقے استعمال کئے۔ اُس نے ہر مرض کا علاج گرفتاری اور مقدمات کے اندراج سے کیا۔ ایک مقدمے میں ضمانت پر رہائی ہوئی تو جھٹ سے دوسرا مقدمہ درج کر لیا۔ وارنٹ گرفتاری جاری کئے اور رہائی سے پہلے ہی دوبارہ گرفتاری عمل میں آ گئی۔ اس سے پیپلز پارٹی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا اور حالت یہاں تک پہنچی کہ نوکر شاہی سے عوام کو نجات دلانے کا وعدہ کرنے والی پارٹی خود نوکر شاہی کے خوب صورت جال میں پھنس گئی۔ نوکر شاہی نے عوامی حکومت پر غلبہ حاصل کر لیا۔ حزبِ اختلاف کو احساس ہو گیا کہ سیاسی میدان خالی ہے اور نوکر شاہی یہ جان گئی کہ حکمران جماعت کو اپنے ورکروں سے زیادہ ہماری ضرورت ہے تو ان دونوں مضبوط طاقتوں نے پیپلز پارٹی کا گھیراؤ کر لیا۔ اس کے نتیجے میں قومی اسمبلی میں پارٹی کے اپنے ہی ارکان سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ انہوں نے آئین ساز اسمبلی کی طلبی کے پروانے پر حزب اختلاف کا ساتھ دیا۔ حفیظ پیرزادہ صاحب نے اس کی وضاحت جن الفاظ میں کی ہے، خدا کرے وہ درست ہو اور ارکان نے غلط فہمی میں ایک ایسی دستاویز پر دستخط کر دیئے ہوں جسے حزبِ اختلاف کے ارکان نے تیار کیا تھا ورنہ پارلیمانی محاذ پر وہ اثرات رونما ہو گئے ہیں جنہیں پارٹی کے عدم وجود کی وجہ سے لازمی طور پر جنم لینا ہے اور جنہیں حکومت کی غلط پالیسیوں کی پیداوار ہی کہا جا سکتا ہے۔

کچھ ہوا یوں کہ صدر بھٹو نے اپنی تمام تر توجہ پاکستان کو بین الاقوامی مسائل سے باہر نکالنے پر مرکوز کر دی۔ وہ جنگی قیدیوں کی واپسی، بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے

یانہ کرنے کے مسئلے اور دوسرے خارجی امور کو سلجھانے میں مصروف ہو گئے اور ادھر بائیں بازو کے وزیروں نے اپنا کام دکھا دیا۔ پارٹی کے سیکرٹری جنرل جے اے رحیم نے پارٹی کو اپنی سیاست کی بھینٹ چڑھا دیا۔ کوثر نیازی نے وہی کام دکھایا جو انہوں نے ایوب اور یحییٰ کے دور میں کیا تھا۔ انہوں نے اپنی تمام توانائی اس جانب لگا دی کہ صدر بھٹو کو جماعت اسلامی کا اتحادی بنا دیا جائے۔

آج یہ حالت ہے کہ پاکستان ایک بار پھر غیر یقینی حالات کا سامنا کر رہا ہے۔ عوام کی نظریں صدر بھٹو کی طرف لگی ہوئی ہیں کہ وہ دائیں بازو کے شعبدہ بازوں سے کیسے چھٹکارا حاصل کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ صدر بھٹو مصلحت کا راستہ اپنانے کی بجائے عوام پر اعتماد کریں۔ عوام کو ساتھ ملائیں اور ایوب اور یحییٰ کے اعتمادیوں پر واضح کر دیں کہ انہیں ان کی ضرورت نہیں۔ ایسا نہ ہوا تو حزب اختلاف موقع کے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہے۔ بعض وزیر اپنی پرانی وابستگیوں کا اعادہ کر چکے ہیں۔ نوکر شاہی روزمرہ کے استعمال کی اشیاء کی قیمتوں میں اضافے کے رجحان کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔ یہ سب کچھ اس پلان کا مرکزی خیال ہے جس پر عمل کر کے عوام دشمن طاقتیں اس ملک کی سالمیت پر آخری وار کرنا چاہتی ہیں۔

صدر بھٹو اپنے دوست سوئیکارنو، شہزادہ سہانوک، بن بیلا کی حکومتوں اور ان کی حکمتِ عملی کا بغور مشاہدہ کر چکے ہیں۔ انہیں یقیناً احساس ہو گا کہ ان عظیم شخصیتوں کا ساتھ کس نے دیا اور دھوکہ دینے والے کون تھے۔ کس کی وفاداریاں کس سے وابستہ تھیں اور کون کس پر قربان ہو گئے۔

ہم جانتے ہیں کہ مزدوروں اور کسانوں نے مزدوروں اور کسانوں کا نام لینے والوں پر اپنے خون کے آخری قطرے تک بہا دیئے۔ صدر بھٹو ایک منجھے ہوئے سیاست دان ہیں۔ وہ بخوبی جانتے ہوں گے کہ دائیں بازو کی جانب لے جانے والے کیا چاہتے ہیں اور دائیں بازو پر اعتماد کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے نتائج کیا مرتب ہوں گے اور کیا یہ طاقتیں پاکستان کو موجودہ بحران سے نکالنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

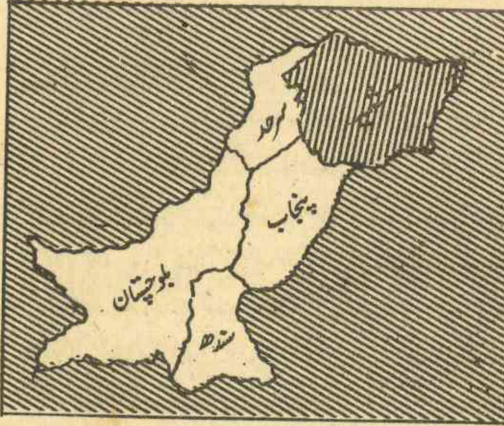
پاکستان کا دایاں بازو صدر بھٹو کا دوست ثابت نہیں ہو سکتا۔ اول تو عوام میں ان کی جڑیں موجود نہیں۔ دوم یہ موقع پرستوں کا ٹولہ ہے۔ ایوب کا دور ہو یا یحییٰ کا دور، ان کا چلن ایک ہی رہا ہے اور انہیں بھی ضرورت پڑی تو یہی لوگ کام آئے۔ صدر بھٹو، پاکستان میں بائیں بازو کے لیڈر کے طور پر سامنے آئے ہیں انہوں نے مزدوروں، کسانوں اور مظلوم طبقات کے کندھوں پر چڑھ کر اقتدار حاصل کیا ہے۔ لہٰذا یہی طبقہ ان کا بہترین اتحادی ثابت ہو سکتا ہے اور وہ اسی پر اعتماد کر سکتے ہیں۔

صدر بھٹو کے بعض ناعاقبت اندیش "دوست" مسلسل یہ تاثر دے رہے ہیں کہ صدر بھٹو سوشلسٹوں کے خلاف ہیں۔ اس میں مرکزی وزیر اطلاعات مولانا کوثر نیازی پیش پیش ہیں۔ یہ بیانات صدر بھٹو کی مولانا مودودی سے ملاقات کے بعد جاری کئے گئے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ عوام کو باور کرایا جائے کہ پاکستان پیپلز پارٹی اور جماعتِ اسلامی کے مابین کوئی سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ اس خوفناک چال کے پس منظر میں کیا عوامل کارفرما ہیں، اس کا فی الحال کھوج لگانا ممکن نہیں۔ البتہ ایک کوشش صاف نظر آ رہی ہے کہ صدر بھٹو کا بائیں بازو کے کارکنوں میں نہ صرف امیج بگاڑا جائے بلکہ اُن سے کاٹ دیا جائے۔

صدر بھٹو کو ان حالات میں فوری اقدام کرنا ہوں گے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کو منظم اور فعال بنانے کے لئے مؤثر کارروائی کی جائے۔ پارٹی کے تمام عہدیدار جو وزیر بن چکے ہیں، ان سے کہا جائے کہ وہ وزارت اور پارٹی کے عہدوں میں سے ایک کو اپنے لئے منتخب کر لیں۔ ایک بیس رکنی ٹیم بنائی جائے جو مغربی پاکستان کا دورہ کرے اور پارٹی کی تنظیم کے ساتھ ساتھ یہ رپورٹ بھی مرتب کرے کہ عوام کن مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں اور انہیں کس طرح حل کیا جا سکتا ہے عوام کی شکایات کیا ہیں اور ان کا ازالہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔

صدر بھٹو فوراً ایسے وزراء کو برطرف کرنے کا اعلان کریں جنہوں نے اپنے سرکاری عہدے سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہو یا جن کے کسی بھی عمل سے پارٹی کو نقصان پہنچا ہو۔

ستمبر کے احوال واقعی:



چاروں صوبوں میں خود مختاری کے مسئلے پر خانہ جنگی ہونے والی ہے

"شگاف پڑ رہے ہیں" چاروں صوبے الگ الگ" نقشہ شائع ہو گیا

واقف حال:

ستمبر کا مہینہ پاکستان کے لیے ہمیشہ ستم گر رہا ہے

اس مرتبہ ستمبر کا مہینہ پاکستان کے لیے "لندن پلان" لے کر آیا۔ سرکاری ذرائع نے وطنِ عزیز کی سالمیت کی بجائے اپنے سیاسی مفادات کے لیے اس کا پراپگینڈہ کیا اور پھر نہ جانے یہ پراپگینڈہ اچانک سمندر کی جھاگ بیٹھ گیا۔ کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ پراپگینڈہ بالکل فراڈ تھا یا اس میں کوئی حقیقت بھی تھی۔ لندن جانے والے سب "بیمار" ایسی مہلک بیماریوں میں مبتلا نہ تھے کہ ان کا علاج لندن کے علاوہ کہیں اور نہ ہو سکتا بلکہ اب تو وطنِ عزیز میں انتہائی مخطرناک اپریشن بھی کیے جا رہے ہیں —— لیکن لندن کی فضا سازشوں کے لیے بڑی ہموار ہے۔ ملک غلام جیلانی ظفر علی شاہ، عطاء اللہ مینگل اور احمد نواز بگٹی کو ایسی کوئی بیماری نہ تھی۔ ولی خان البتہ اب "دیدۂ بینا" سے محروم ہونے کو ہیں۔ اس لیے ان کی بیماری خاصی بڑھ چکی ہے۔ "لندن پلان" کا نقشہ بالآخر بدنام زمانہ صحافی ٹونی نے "ٹائمز" میں شائع کر دیا ہے جس کا عنوان "شگاف پڑ رہے ہیں" ہے اور جس میں چاروں صوبوں کی سرحدوں کو الگ الگ دکھایا گیا ہے۔ یہ ولی خان کے انٹرویو کی روشنی میں ہے۔ اس سے پہلے پاکستان کے پیدائشی مخالف اور بنگلہ دیش کے اصل خالق برطانوی صحافی پیٹر ہیزل ہرسٹ نے بھی یہ پیشگوئی کر دی تھی کہ چاروں صوبوں میں خود مختاری کے مسئلہ پر خانہ جنگی ہونے والی ہے۔

لندن میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ جس طرح خبریں آ رہی ہیں اور لندن جانے والے حضرات کی جو سیاسی پالیسیاں ہیں، ان سے لوگ اچھی طرح واقف ہیں۔ اس لیے اگر سرکاری ذرائع یوں ان کو نہ بھی اچھالتے تو عوام پر ان سازشیوں کی سرگرمیاں آشکار تھیں۔ لیکن ریڈیو، ٹیلی ویژن کے پروگراموں نے اُلٹا اثر دیا کہ اس میں حقیقت کم، زیبِ داستاں زیادہ ہے۔ اور پھر جس طرح یہ اچانک ختم ہو گئے اس سے عوام پر بہت ہی بُرا اثر پڑا۔ اس پراپگینڈہ سے لوگوں میں یہ تاثر جنم لے رہا تھا کہ اب مرکزی حکومت ان علیحدگی پسندوں اور سازشیوں کے خلاف کوئی کارروائی کرے گی۔ حالات انتہائی خطرناک ہو گئے ہیں مگر بزنجو صاحب سے صدر کی بات چیت اور اسمبلی میں حزبِ اختلاف کی تحریکِ التواء کے بعد، ریڈیو، ٹیلی ویژن سے یہ پروگرام اس طرح غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ! یہ تو ایسا ہوا کہ ریڈیو ٹیلی ویژن محض کھلونے ہیں جنہیں جب چاہا استعمال کر لیا جب چاہا توڑ دیا —— یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ کتنے حساس ذرائع ہیں۔ سننے والوں پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔ نفسیاتی طور پر یوں پروگرام اچانک ختم ہو جانے سے ریڈیو، ٹیلی ویژن سے لوگوں کا اعتماد بالکل اُٹھ گیا ہے۔ آئندہ ریڈیو ٹیلی ویژن سے حکومت کوئی کام نہیں لے سکے گی!

اصلی "لندن پلان" اب بھی لندن میں تشکیل پا رہا ہے۔ اس کے سب کردار اپنی بھیانک کوششوں میں مصروف ہیں۔ البتہ مولانا کوثر نیازی وزیرِ اطلاعات و نشریات کا "لندن پلان" ۲۱ ستمبر کو ختم ہو گیا۔ پروگراموں کا یوں شروع ہونا اور اچانک ختم ہونا —— "لندن پلان" سے بھی بڑی سازش ہے۔ کیونکہ اس طرح "لندن پلان" کی خطرناک سازش کو جھوٹا ثابت کر دیا گیا اس طرح عوام ان لندنی سازشیوں سے غافل ہو گئے۔

"لندن پلان" کا سب سے بڑا ثبوت تو ولی خان کے وہ انٹرویو ہیں جو آج کل وہ مختلف غیر ملکی اخبارات کو دے رہے ہیں۔ خاص طور پر ہندوستان سٹینڈرڈ کے نامہ نگار کو دیا گیا انٹرویو "لندن پلان" ہی کا تو حصہ ہے (یہ انٹرویو اسی شمارے میں صفحہ ۱۵ پر دیا جا رہا ہے) اس کے بعد ٹائمز کا انٹرویو! ان انٹرویوز میں ولی خان —— سب سے زیادہ اس بات کو اچھال رہے ہیں کہ بھارت بھٹو پر کیسے اعتماد کر سکتا ہے وہ تو ایک ہزار سال تک جنگ لڑنے کی دھمکیاں دیتے رہے ہیں۔ پھر یہاں تک کہہ دیا ہے کہ بھارت مجھ سے معاملہ کرے میں زیادہ قابلِ اعتماد ہوں —— ! سوچنے کی بات یہ ہے کہ ولی خان اب یہ سب باتیں کیوں کہہ رہے ہیں۔ یہ انہیں اس وقت کہنا چاہیے تھا جب صدر بھٹو قومی اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ لے کر بھارت جا رہے تھے۔ یہ مسئلہ وہ اس وقت اٹھاتے، یا اس وقت اٹھاتے جب معاہدۂ شملہ قومی اسمبلی میں توثیق کے لیے پیش کیا گیا۔ اس وقت انہوں نے صدر بھٹو کی کیوں حمایت کی۔ اصل مسئلہ یہ ہوا کہ چین کا ویٹو —— ولی خان کی سیاسی حکمت عملی میں غیر متوقع طور پر آیا۔ اس سے ان کا سارا پلان چوپٹ ہو گیا۔ اس لیے انہوں نے جھلا کر سیدھے صدر بھٹو پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی بھارت نے بھی فوجوں کی واپسی میں تاخیر کر دی اور معاہدۂ شملہ ہوا میں معلق ہو گیا۔ اس اثناء میں غفار خان نے اپنی

خود ساختہ جلاوطنی کو ختم کر کے پاکستان آنے کا اعلان کیا۔ ان کا پورے پاکستان کے دورے کا پروگرام تھا۔ اس سے نیپ کو پنجاب سندھ میں تقویت پہنچانے کا پروگرام تھا مگر مرکزی حکومت کی طرف سے تنبیہہ کے بعد اجمل خٹک پنڈی سے کابل بھاگ گئے۔ اور منت سماجت کرکے "باچا خان" کو پاکستان آنے سے منع کیا۔

ادھر پیپلز پارٹی کے جوڑ توڑ کے ماہرین اور دائیں بازو کے موقع پرستوں نے صدر بھٹو کو دائیں بازو کی جماعتوں سے گٹھ جوڑ کا مشورہ دیا اور صدر بھٹو نے اس جماعت کے قریب المرگ امیر سے ۷۰ منٹ تک ملاقات کی جس کے بارے میں خود پیپلز پارٹی کہہ چکی ہے کہ اس جماعت سے ہمارا کوئی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ یہ جماعت تحریکِ پاکستان کی خود مخالف رہی ہے۔ اس جماعت کے پاس قومی اسمبلی میں صرف تین سیٹیں ہیں اور خود صدر بھٹو کئی غیر ملکی صحافیوں سے کہہ چکے ہیں کہ جماعتِ اسلامی اب کوئی طاقت نہیں رہی —— لیکن اپنے ناعاقبت اندیش مشیروں کے کہنے پر انہوں نے مولانا مودودی سے ۷۰ منٹ تک ملاقات کی۔ اس ملاقات میں کیا ہوا یہ تو صدر بھٹو ہی جانتے ہیں یا جماعتِ اسلامی والے بہر حال اس سلسلے میں پیپلز پارٹی کے اسلام پسند اور جماعتِ اسلامی والے "ہم زبان" ہیں کہ اس ملاقات میں کمیونسٹوں کا قلع قمع اور پیپلز پارٹی سے ان کے اخراج پر سمجھوتہ ہو گیا ہے۔

یہ کمیونسٹ کون لوگ ہیں؟ پیپلز پارٹی کے ان مخلص کارکنوں اور رہنماؤں کو "کمیونسٹ" کا نام دیا جاتا ہے جو پیپلز پارٹی کے منشور کو اوّل و آخر قرار دیتے ہیں۔ اس کی مخالفت کرنے پر وہ پارٹی کے اعلیٰ ترین رہنما پر بھی تنقید سے نہیں گھبراتے۔ ان کا ایمان ہے کہ پیپلز پارٹی کا منشور ہی ملک کو بچا سکتا ہے۔ اس منشور میں ردّ و بدل کا کسی کو حق نہیں۔ اس پر کوئی سمجھوتہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ایسے با اصول لوگوں کو پیپلز پارٹی کے موقع پرست، "کمیونسٹ" کا نام دیتے ہیں۔ جماعتِ اسلامی کو گزشتہ الیکشن میں جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینے والے لوگ بھی یہی تھے۔ اس لیے جماعتِ اسلامی ان کو راستے سے ہٹانا چاہتی ہے۔

صدر بھٹو —— دائیں بازو کے نزدیک اس لیے آ رہے ہیں کہ ان کو "بنگلہ دیش" تسلیم کرنا ہے۔ اس میں نیپ کی طرف سے تو حمایت حاصل ہے۔ دائیں بازو اور بالخصوص جماعتِ اسلامی نے اس کی مخالفت کو ایک تحریک بنا لیا ہے۔ نہ جانے صدر بھٹو کو جماعتِ اسلامی سے کیسا خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ اس کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں اور اس کی حمایت حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔ اس ملاقات کو جماعتِ اسلامی نے اپنے احیائے نو کا ذریعہ بنا لیا ہے اگرچہ انہوں نے نئے انتخابات کی مخالفت شروع کر دی ہے لیکن اس ملاقات سے ان کے مردہ جسد میں روح پڑ گئی ہے۔ پنجاب میں صدر بھٹو اپنی ہی پارٹی اور اپنے ہی کارکنوں کو اگر اعتماد میں لیتے اور ان کو قائل کرتے تو اس کا ان کی اپنی پارٹی میں بھی اچھا اثر پڑتا۔ پارٹی مضبوط بھی ہوتی اور ایک سیاسی "صفر" کو "عدد" بننے کی ہمت نہ ہوتی۔

صدر بھٹو کی تقریروں اور بیانات سے اگرچہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ملک میں ہونے والی ہر بات سے واقف ہیں، ان کے خبر رساں انہیں خبروں، افواہوں اور خفیہ سرگرمیوں سے بھی آگاہ رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ —— اپنی بنیاد یعنی اپنی پارٹی کو مضبوط رکھنے کی حقیقت سے کیوں بے خبر ہیں۔ ملک اس وقت جہاں پہنچ چکا ہے وہاں ملک کی عمارت کو شخصیتوں کی بنیاد پر نہیں کھڑا کیا جا سکتا۔ اب تو کارکنوں اور عوام کو اعتماد میں لے کر ہی اپنے اقتدار کی میعاد کو توسیع دی جا سکتی ہے۔

دوسرے جن مسائل کی طرف سے صدر بھٹو اور ان کے ساتھی پہلو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں اور جنہیں فوری طور پر حل کرنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں وہی سب سے زیادہ خطرناک مسائل ہیں اور انہی مسائل پر پہلے بھی پاکستان میں بحران پیدا ہوئے ہیں،

ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے ایک بار پھر عوام کا اعتبار اُٹھ گیا

حکومتوں کے تختے اُلٹے، سازشیں ہوئیں، ملک کے ٹکڑے ہوئے۔ اب پھر وہی مسائل درپیش ہیں، نیشنل عوامی پارٹی انہی مسائل کا سہارا لے کر ملک میں تحریک چلانے کے منصوبے بنا رہی ہے۔ غیر ملکی اخبار نویس بھی انہی مسائل پر زور ڈال رہے ہیں۔ صوبوں میں اگر سیاسی ابھار کو تقویت مل سکتی ہے تو انہی مسائل سے!

یہ مسائل دستوری مسائل ہیں جو بچے کھچے پاکستان کے ڈھانچے کو فِٹ رکھ سکتے ہیں۔ اگر یہ ڈھانچہ فِٹ نہیں رہے گا تو بات ہی آگے نہیں بڑھے گی۔ دستوری مسائل ہیں:۔

(۱) صوبائی خود مختاری کی شرح کا تقرر
(۲) مرکز کے اختیارات کا تعین
(۳) ایوانِ بالا و ایوانِ زیریں کے بارے میں واضح پالیسی
(۴) وفاقی پارلیمانی نظام یا وفاقی صدارتی نظام؟

اس قسم کے مسائل اور خاص طور پر صوبائی خود مختاری کا تعین انتہائی ضروری ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو "لندن پلان" کے سازشیوں کو انتشار پھیلانے کا موقع ملے گا اور ویسے بھی "بلی کے آگے کبوتر کے آنکھیں بند کر لینے" کے مترادف ہے۔

اس دستوری بحران نے صوبہ سرحد میں قیوم لیگ کے ۱۹ ارکانِ اسمبلی کو بغاوت پر اکسایا ہے۔ اس طرح قومی اسمبلی میں پیپلز پارٹی کے ۳۶ ارکان نے حزبِ اختلاف سے "ہم زبان" ہو کر دستور ساز اسمبلی کا اجلاس بلانے کا مطالبہ کر دیا۔ ۳۶ ارکانِ اسمبلی کا وزراء کے خلاف متحد ہو جانا اگرچہ انتہائی صحت مند رجحان ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ برسرِ اقتدار پارٹی کے لیے لمحۂ فکریہ بھی کہ اب "سب ٹھیک ہے" کا نعرہ نہیں چلے گا محمود علی قصوری کے ڈکٹیٹرانہ طرزِ عمل نے پیپلز پارٹی کے ۳۶ ارکانِ اسمبلی کو حزبِ اختلاف کا ہمنوا ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ احتجاج رفیع رضا کے خلاف بھی ہے۔ ان غیر منتخب صاحب کے نظریات خیالات اور وفاداریوں کا کسی کو علم نہیں مگر وہ انتہائی اہم حیثیت اختیار کر گئے ہیں کہ دستور سازی میں بھی وہ صفِ اوّل میں ہیں۔ بھارت سے بات چیت وغیرہ میں بھی آگے آگے ہیں۔ سب آٹو کریٹوں اور بیورو کریٹوں کے خلاف ۳۶ ارکانِ اسمبلی کا احتجاج ایک صحت مند رجحان بھی ہے اور پیپلز پارٹی کے "چمچوں" (اس سے مناسب لفظ اور کوئی نہیں) کے لیے خطرے کی گھنٹی بھی کہ اب کسی مسئلے پر بھی یہ بلاک رکاوٹ بن سکتا ہے اور اس وقت پیپلز پارٹی نیشنل عوامی پارٹی کے خلاف جس سیاسی محاذ آرائی میں مصروف ہے اس میں یہ بلاک نیپ کی حمایت کر سکتا ہے۔

خطرناک صورتِ حال یہ ہے کہ سیاسی پارٹیوں کی سرگرمیوں کا دائرۂ کار تو محض اپنی اعلیٰ سطحی حلقوں تک ہے۔ چند شخصیتیں سیاسی مسائل پر سوچ رہی ہیں۔ عوام اور کارکنوں کو ان مذاکرات کا ذرّہ برابر علم نہیں ہے۔ لیکن عوام کی حالت یہ ہے کہ وہ ہر بات اور ہر خبر پر پوری طرح سوچتے ہیں، غور کرتے ہیں، پوچھتے ہیں، جاننا چاہتے ہیں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات سے لوگوں کا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ وہ اب "اصل خبر کیا ہے؟" کی تلاش میں رہتے ہیں۔ لوگ انتہائی حساس اور باشعور ہو گئے ہیں۔ وہ اب پہلے کی طرح سب کچھ حکومت اور سیاست دانوں پر نہیں چھوڑ سکتے۔ کیونکہ آج تک جو کچھ ہوا ہے اس میں اگرچہ وہ شریک نہیں تھے لیکن اس کا نقصان ان کو ہوا ہے۔ بھوک اور افلاس میں عوام مبتلا ہیں۔ اس لیے وہ اب اپنا حق سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے اور ہونا چاہیے، اس کا انہیں علم ہو۔



ایوان صنعت وتجارت کراچی پر بے تاج بادشاہ
ابراہیم جمال کی اجارہ داری کب تک

مینجنگ کمیٹی کے حالیہ انتخابات میں دھاندلی

" ایوانِ صنعت وتجارت کراچی کی مینجنگ کمیٹی کے کلاس اوّل کے انتخابات میں مسٹر قاسم عثمان کنڈا والا (میسرز کریسنٹ ٹریڈرز) مسٹر یوسف جی منڈوی والا (میسرز غلام علی۔ ٹی منڈوی والا) مسٹر محمد مسلم (میسرز فضل ویونگ فیکٹری) اور مسٹر اے۔ خالق (میسرز امین ایجنسیز لمیٹڈ) بلامقابلہ کامیاب قرار دیئے گئے ہیں۔ (ایک خبر)

بظاہر یہ خبر سیدھی سادی ہے۔ اس میں سنسنی خیزی ہے نہ اچنبھے کی کوئی بات۔ عوام ویسے بھی ایوانِ صنعت وتجارت کی سرگرمیوں اور خبروں میں دلچسپی نہیں لیتے۔ وہ دلچسپی بھی کیوں لیں۔ جن سرمایہ داروں کی یہ ایوان نمائندگی کرتا ہے، انہوں نے عوام کو، اس ملک کو کیا دیا؟ بھوک افلاس، ناداری اور معاشی غلامی، سرمایہ داروں کے محافظ اس ایوان نے ہمیشہ ترقی پسند اور انقلابی نظریات کی مخالفت کی۔ عوام کی ترقی اور فلاح میں رکاوٹ پیدا کی۔ اور جب سے پیپلز پارٹی برسرِ اقتدار آئی ہے۔ یہ ایوان اُس کے منشور کو ناکام بنانے، معاشی بحران پیدا کرنے میں سرگرم عمل ہے۔ مینجنگ کمیٹی کے کلاس اوّل کے انتخابات میں مندرجہ بالا افراد کو بلامقابلہ کامیاب قرار دیئے جانا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کیونکہ یہ افراد ایوانِ صنعت وتجارت کے "بے تاج بادشاہ" اور اجارہ دار لطیف ابراہیم جمال (حسین انڈسٹریز) کے حواری ہیں۔

یہ ایک چونکا دینے والی حقیقت ہے کہ ایوانِ صنعت وتجارت پر حسین انڈسٹریز کے لطیف ابراہیم جمال کی اجارہ داری ہے۔ فیڈریشن آف پاکستان، چیمبرس آف کامرس اینڈ انڈسٹری اور آر۔ سی ڈی چیمبرس ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ موصوف آر۔ سی۔ ڈی چیمبرس کے تاحیات رکن ہیں اور اس کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ صنعتی اور تجارتی حلقوں میں یہ ایوانِ صنعت وتجارت اور فیڈریشن کے "کنگ میکر" کہلاتے ہیں۔ یہ ایسا چکر چلاتے ہیں کہ ان کے حواریوں اور ایجنٹوں کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نہ تو ایوانِ صنعت وتجارت کا صدر بن سکتا ہے اور نہ مینجنگ کمیٹی کا رکن۔

ایوّب خان کو اپنی گرفت میں لینے کے لئے لطیف ابراہیم جمال نے مسٹر شیرازی کو ایوانِ صنعت وتجارت کا صدر بنوایا، کیونکہ مسٹر شیرازی ایوّب خان کے "شہزادے" گوہر ایوب کے یارِ غار تھے۔ ایوب کے بیٹے کے دوست کو ایوانِ صنعت وتجارت کا صدر بنا کر لطیف ابراہیم جمال نے مراعات حاصل کیں اور اپنے مفادات کا تحفظ کیا۔ ایوّب خان محروم اقتدار ہوئے تو لطیف ابراہیم جمال نے ایوان کی صدارت اپنے دوسرے حواری عبدالرحمان حاجی حبیب، جنہیں تجارتی حلقوں میں "مٹھو سیٹھ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کے سپرد کر دی۔

پیپلز پارٹی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد بھی ایوانِ صنعت وتجارت اور فیڈریشن کے اجارہ داروں نے اپنے روّیہ میں تبدیلی نہ کی، مزدور دشمنی میں مصروف رہے۔ ملک کے معاشی بحران کو بڑھاتے رہے۔ تاکہ پیپلز پارٹی اپنے منشور پر عمل نہ کر سکے اور اس طرح عوام میں غیر مقبول ہو جائے۔ اس موقع پر بعض ابھرتے ہوئے سرمایہ دار آگے آئے۔ اِن میں سے کچھ اپنے تضادات کی وجہ سے ایوانِ صنعت وتجارت پر سے لطیف ابراہیم جمال کی اجارہ داری ختم کرنا چاہتے تھے۔ اور بعض پیپلز پارٹی کے رکن یا اس کے معاشی منشور سے متفق ہونے کی وجہ سے ایوان کو صحت مندانہ پالیسی پر چلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایوانِ صنعت وتجارت کی مینجنگ کمیٹی کلاس اوّل کے انتخابات میں حصّہ لینے کا فیصلہ کیا۔ یہ انتخابات ۱۹ ستمبر ۱۹۷۲ء کو ہونے والے تھے۔ مینجنگ کمیٹی میں بارہ رکن ہوتے ہیں۔ جن میں سے ⅓ ہر سال منتخب ہوتے ہیں۔ اِس سال کلاس اوّل میں چار نشستوں کے لئے انتخابات ہونے تھے۔ ان نشستوں کے لئے چھ امیدوار تھے جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ مسٹر رفیق احمد میاں (میسرز جامعہ انڈسٹریز لمیٹڈ)

۲۔ مسٹر ایم۔ رفیق اختر (میسرز کے ڈی سی بورڈز لمیٹڈ)



CHAMBER OF COMMERCE & INDUSTRY,

AIWAN - E - TIJARAT - NICOL ROAD - P.O. BOX 4158 - KARACHI-2

No. II-10/132 16th Septemb

TO ALL CLASS I MEMBERS

ELECTION OF MEMBERS ON THE MANAGING COMMITTEE
TO FILL THE VACANCIES UNDER ARTICLE 34(c) CAUS
BY RETIREMENT UNDER ARTICLE 34(a)

Class (i) members of the Chamber are hereby notified the following candidates have withdrawn their nomination for Election as Class (i) representative on the Managing Committe

(1) Mr.Rafiq Ahmed Mian
M/s.Jamia Industries Ltd.

(2) Mr.M.Rafiq Akhtar
M/s.K.D.C.Boards Ltd.,

Consequently there are now the following four candid for Election to fill the Four vacancies. As the number of can are equal to the number of vacancies, there shall be no E for Class (i), on 19th September, 1972, as communicated vide Circular No:II-10/131 dated 13th September, 1972:-

(1) Mr.Kassam Usman Kandawala
M/s.Crescent Traders

(2) Mr.Yusuf G. Mandviwala
M/s.Ghulamali T. Mandviwala

(3) Mr.Mohamed Muslim
M/s.Fazal Weaving Factory

(4) Mr. A. Khaliq
M/s. Amin Agencies Ltd.

(AGHA M. GHOUSE)
Secretary/Returning Officer.

۳۔ مسٹر قاسم عثمان کنڈا والا (میسرز کریسنٹ ٹریڈرز)
۴۔ مسٹر یوسف۔ جی۔ منڈوی والا (میسرز غلام علی۔ ٹی۔ منڈوی والا)
۵۔ مسٹر محمد مسلم (میسرز فضل ویونگ فیکٹری۔)
۶۔ مسٹر اے۔ خالق (میسرز امین انجینیئرز لمیٹڈ)

مسٹر رفیق احمد میاں پاکستان پیپلز پارٹی کے سرکردہ رہنما ہیں اور مسٹر ایم۔ رفیق اختر ایک ابھرتے ہوئے سرمایہ دار، دونوں حکومت اور ایوان صنعت و تجارت کے درمیان خوش گوار تعلقات کے حامی ہیں اور پیپلز پارٹی کے اقتصادی پروگرام کو عمل میں لانا چاہتے ہیں۔ اس لئے تمام ابھرتے ہوئے سرمایہ داروں کی انہیں حمایت حاصل تھی۔ ان کی کامیابی یقینی تھی۔ لیکن ان کی کامیابی سے لطیف ابراہیم جمال کی اجارہ داری ختم ہونے کا امکان تھا۔ ان کی موجودگی میں ایوان کا "بے تاج بادشاہ" عوام دشمنی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی اجارہ داری برقرار رکھنے کے لئے لطیف ابراہیم جمال نے ایوانِ صنعت و تجارت کے صدر مسٹر عبدالرحمٰن حاجی حبیب سے گٹھ جوڑ کرکے ایک منصوبہ تیار کیا۔

اس منصوبہ کے تحت عبدالرحمان حاجی حبیب نے ان چھ امیدواروں کو اپنے دفتر میں بلایا خاطر و مدارت کی۔ اس کے بعد یوں گویا ہوئے۔

"دیکھئے صاحب! ملک میں انتشار ہے، خلفشار ہے۔ بیدا واریں دن بدن کم ہو رہی ہے۔ ہر نیا سورج نت نئے ہنگامے لئے طلوع ہوتا ہے۔ اس وقت ہمیں اتحاد کی سخت ضرورت ہے۔ اگر یہ انتخابات ہوتے تو ہمارے اختلافات منظر عام پر آجائیں گے۔ میری تجویز یہ ہے کہ آپ سب حضرات اپنے کاغذاتِ نامزدگی واپس لے لیں۔ اس کے بعد ہم دوستانہ ماحول میں گفتگو کریں گے۔ میں آپ حضرات میں سے کسی دو افراد سے درخواست کروں گا کہ وہ ان انتخابات سے دست بردار ہو جائیں، تاکہ باقی چار بلا مقابلہ منتخب ہوں اور ہم یہ ثابت کر سکیں کہ ہم میں اتحاد ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ کاغذات نامزدگی واپس لینے کے لئے میں کسی پر ناجائز دباؤ استعمال نہیں کروں گا۔ جب تک آپ میں سے کوئی دو حضرات اپنے کاغذاتِ نامزدگی واپس لینے پر رضامند نہیں ہوں گے۔ اس وقت تک ہماری گفت و شنید جاری رہے گی۔"

یہ کہہ کر انہوں نے کاغذاتِ نامزدگی واپس لینے کے فارم ان امیدواروں کی طرف بڑھا دیئے اور کہا۔ "انہیں پُر کر دیں۔" قاسم عثمان کنڈا والا، یوسف جی منڈوی والا، محمد مسلم اور اے۔ خالق نے اپنے فارم پُر کر دیئے۔ لہٰذا اشرما حضوری میں میاں رفیق اور رفیق اختر کو بھی نامزدگی کے فارم پُر کرنے پڑے

نامزدگی کی واپسی کے کاغذات لینے کے بعد عبدالرحمٰن حاجی حبیب نے کہا کہ اب کافی وقت ہو چکا ہے۔ کل پرسوں میں آپ سب حضرات کو دوبارہ یہاں آنے کی زحمت دوں گا۔ پھر ہم تبادلہ خیال کریں گے۔

لیکن حاجی حبیب نے بات چیت کرنے کی بجائے اگلے دن ہی مسٹر رفیق احمد میاں اور مسٹر ایم رفیق اختر کی نامزدگی کی واپسی کے کاغذات ایوانِ صنعت و تجارت کے سیکریٹری مسٹر آغا ایم۔ عزت کو دیدیئے۔ مسٹر آغا الیکشن آفیسر تھے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۶ ستمبر ۱۹۷۲ء کو ایک مراسلہ نمبر ۱۱۔ ۱۰/ ۱۳۲ جاری کیا۔ جس میں قاسم عثمان کنڈا والا، یوسف جی منڈوی والا، محمد مسلم اور اے خالق کو بلا مقابلہ منتخب قرار دیا گیا۔

یہ چاروں سرمایہ دار جن کو بلا مقابلہ منتخب قرار دیا گیا ہے۔ ایوان صنعت و تجارت کے "بے تاج بادشاہ" اور اجارہ دار لطیف ابراہیم جمال کے خاص آدمی ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں کوئی خصوصیت نہیں۔ آج تک انہوں نے صنعتی اور تجارتی ترقی کے لئے کوئی تجویز پیش نہیں کی اور نہ ہی برآمد میں اضافہ کے سلسلے میں کوئی منصوبہ تیار کیا۔ مسٹر یوسف جی منڈوی والا کے انتخاب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ گزشتہ سال پورٹ ٹرسٹ میں ایوان صنعت و تجارت کی نمائندگی کے انتخابات میں دو امیدوار تھے۔ ایک عبدالرحمٰن حاجی حبیب، دوسرے یوسف۔ جی منڈوی والا۔ مسٹر عبدالرحمٰن چاہتے تھے کہ وہ بلا مقابلہ منتخب ہوں۔ انہوں نے یوسف منڈوی والا سے گفت و شنید کی اور یہ پیش کش کی کہ اگر وہ ان کے حق میں دست بردار ہو جائیں تو آئندہ سال انہیں ایوان صنعت و تجارت کی مینجنگ کمیٹی کا رکن بنا دیا جائے گا۔ چنانچہ ایوان کے حالیہ فراڈ انتخابات میں یوسف جی منڈوی والا کو منتخب کرکے عبدالرحمٰن حاجی حبیب نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

اس غیر قانونی اور فراڈ الیکشن نے صنعتی و تجارتی حلقوں میں انتشار اور خلفشار پیدا کر دیا ہے ان کے ذہنوں میں بار بار یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب تمام امیدواروں نے اپنے کاغذات نامزدگی واپس لے لئے تھے۔ تو پھر لطیف ابراہیم جمال کے چار منظورِ نظر امیدوار کس طرح بلا مقابلہ کامیاب قرار دیدیے گئے تھے۔ پیپلز پارٹی کی حکومت اگر اپنا اقتصادی منشور پر عمل کرنا چاہتی ہے تو اُسے چاہیئے کہ وہ ایوانِ صنعت و تجارت کراچی میں سے اجارہ داری ختم کرے۔ کیونکہ یہ اجارہ دار، سرمایہ دار اُس کے اقتصادی منشور کے نفاذ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں اور معاشی بحران کو مزید بڑھا کر اس کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ کراچی کا ایوان صنعت و تجارت ملک کی پوری اقتصادیات کو کنٹرول کرتا ہے۔ اس لئے اس پر سے اجارہ دار سرمایہ داروں کی گرفت کو ختم کرنا بہت ضروری ہے۔ اس مقصد کے لئے حکومت کو چاہیئے کہ وہ ایوان صنعت و تجارت کی حالیہ مینجنگ کمیٹی کے حالیہ انتخابات کو فوری طور پر کالعدم قرار دے اور تحقیقاتی کمیشن قائم کرے۔

فیڈریشن آف پاکستان، چیمبرس آف کامرس اینڈ انڈسٹری

اِس فیڈریشن پر بھی جیبن انڈسٹری کے لطیف ابراہیم جمال کی اجارہ داری ہے۔ اس فیڈریشن نے ہمیشہ مشرقی پاکستان کے ابھرتے ہوئے سرمایہ داروں کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک کیا۔ اجارہ دار سرمایہ داروں کے مفادات کا تحفظ کیا۔ اسی بنا پر ۱۹۶۹ء میں مشرقی پاکستان کے سرمایہ داروں نے جائز نمائندگی کا مطالبہ کیا۔ لیکن لطیف ابراہیم جمال اور اس کے حواریوں نے یہ مطالبہ مسترد کر دیا۔ جب اختلافات مزید وسیع ہوئے تو لطیف ابراہیم نے فوجی حکومت سے سازباز کرکے فیڈریشن کا آئین معطل کروا دیا۔ اس سے مشرقی پاکستان کے سرمایہ داروں نے سیاسی فائدہ اٹھایا اور عوامی لیگ سے مل کر علیحدگی کی تحریک کو مزید پروان چڑھایا۔ ۱۹۷۰ء میں لطیف جمال نے اپنے منظور نظر شالیمار ٹیکسٹائل ملز کے مینجنگ ڈائریکٹر اشرف کو فیڈریشن کا ایڈمنسٹریٹر بنوا دیا۔

اِس فیڈریشن کا ایک اور کارنامہ ملاحظہ کیجئے۔

موجودہ حکومت نے غیر ممالک میں جمع زرمبادلہ منگوانے کے لئے آخری تاریخ مقرر کی۔ صنعت کاروں اور گماشتہ سرمایہ داروں پر دباؤ ڈالنے کے لئے حکومت نے داؤد، ولیکا اور جنرل حبیب اللہ کو گرفتار کر لیا۔ ان کی گرفتاری نے سرمایہ داروں میں کھلبلی مچادی۔ فیڈریشن اور ایوان صنعت و تجارت کے اجارہ دار سر جوڑ کر بیٹھے، منصوبے مرتب کئے اور پھر منصوبے کے مطابق فیڈریشن کا ایک وفد حکومت سے ملا اور پیش کش کی کہ حکومت کو جتنے زرمبادلہ کی ضرورت ہے وہ دینے کے لئے تیار ہیں۔ تجویز میں کہا گیا کہ حکومت داؤد، ولیکا اور جنرل حبیب اللہ کو غیر مشروط طور پر رہا کر دے۔ جتنی مالیت کا زرِ مبادلہ اسے درکار ہے بتا دے۔ حکومت کے اعلان کے مطابق سرمایہ دار اپنے زرمبادلہ کی مالیت بتائیں گے۔ اگر سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کا

باقی صفحہ ۵ پر ملاحظہ فرمائیں

لوگ کتنے سخی ہیں

ایک مرتبہ میں جا رہا تھا۔ ایک سڑک پہ لوگوں کا ہجوم دیکھ کر رک گیا۔

میں نے کہا: "سلام علیکم۔ بھئی کیا حال چال ہے۔ آپ لوگوں کا کیا حکم ہے۔"

انہوں نے کہا: "بس آپ لوگ کھڑے ہو گئے۔ ہمیں کوئی شکوہ نہیں ہے۔ ہمارا کوئی حکم نہیں ہے۔ آپ کھڑے نہ ہوتے تو ہمیں شکوہ ہوتا۔"

سخی لوگ ہیں، ان لوگوں کی سخاوت کو کون پہنچ سکتا ہے۔ غریب بھی ہیں۔ پریشان بھی۔ سخاوت کا یہ عالم ہے کہ ہم لوگ کھڑے ہو گئے تو کوئی شکوہ شکایت نہیں۔

گورنر سندھ
میر رسول بخش تالپور
کا خصوصی انٹرویو



'میری ذات کا نچوڑ —— محبّت اور پیار'

بھارتی عوام کے نام گورنر سندھ کا پیغام

گزشتہ دنوں ایک بھارتی صحافی دیوان بریندر ناتھ —— بھارت کی خبر رساں ایجنسی پریس ایشیا انٹرنیشنل کی طرف سے پاکستان کے دورے پر آئے۔ دیوان بریندر ناتھ آل انڈیا ریڈیو سے ظفر پیامی کے نام سے خبروں پر تبصرہ کرتے ہیں۔ انہوں نے گورنر سندھ جناب میر رسول بخش تالپور سے خصوصی ملاقات کی اور سندھ کے بنیادی مسائل پر گفتگو کی۔ پاکستان میں یہ گفتگو صرف ہفت روزہ "الفتح" پیش کر رہا ہے۔ قارئین "الفتح" کو اس سے سندھ کے مسائل اور ان کے حل کے بارے میں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوں گی —— ہم یہ انٹرویو دیوان بریندر ناتھ کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں —— (ادارہ)

دیوان بریندر ناتھ —— میں نے آپ کو سنا بھی تھا آپ کو پڑھا بھی تھا۔ اخبارات میں بھی دیکھا۔ پاکستان کے رہنماؤں میں آپ کا خاص رتبہ ہے۔

گورنر —— بڑی محبت ہے آپ کی۔

دیوان —— بڑی خوشی کی بات ہے پاکستان میں پہلی مرتبہ جمہوری نظام قائم ہوا ہے۔ آپ عوام کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ ہمارے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ آج ہم بات کر رہے ہیں عوام کے چنے ہوئے جمہوری نمائندوں سے۔

گورنر —— ہم تو عوام کے معمولی خادم ہیں۔

دیوان —— ہمارے ملکوں میں آج کے تعلقات میں بھی آپ کے صوبے کا کچھ رول ہے۔ ایک مسئلہ تارکین وطن کا بھی ہے —— جو کہ ——

گورنر —— ہماری حکومت کے فرائض میں ہے۔ وہ ہمارے شہری ہیں۔ اگر کچھ ناخوشگوار حالات تھے اور وہ معمول پر ہو گئے تھے تو حکومت کا فرض ہے کہ ان شہریوں کی اسی طرح دیکھ بھال کرے جس طرح دوسرے شہریوں کی —— جمہوری حکومت کے فرائض میں ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں جو

ہاریوں میں دس لاکھ ایکڑ زمین کی تقسیم

فرائض میں حکومت بہت اچھی طرح پورا کر رہی ہے۔ اقلیتی فرقوں کے لئے تو اور بھی فرائض زیادہ ہوتے ہیں۔ جو پریشانی اور تکلیف ہوتی ہے اور خاص طور پر دور کیا جائے۔

دیوان ـــــ ایک ٹیم آپ کی وہاں گئی بھی ہے۔ ایک چیز مجھے آپ تک پہنچانے میں خوشی ہوتی ہے کہ ذاتی طور پر بھی آپ کی ذات میں وہاں کے جو سندھی مہاجر پہلے سے گئے ہوئے ہیں انہیں مکمل اعتماد ہے۔ میں بمبئی میں تھا تو خاص طور پر لوگوں نے مجھ سے کہا جن میں مہاجر صحافی بھی ہیں۔ آپ کی ذات پر انہیں خاص اعتماد ہے۔

گورنر ـــــ ہماری ذات کا رہنما اصول انسانیت سے محبت اور پیار ہے۔ ہمیں ہر طبقے سے پیار ہے انسان سے پیار کیا ہے ـــــ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے، ہم آسانی سے ان تکالیف کو دور کر لیں گے۔ صدیوں سے عوامی انسانی تعلقات ہیں، محض چھوٹے وقفے کی بناء پر ہم اتنے دور نہیں چلے گئے ہیں۔ آسانی سے اور خوش اسلوبی سے پورا کر لیں گے۔

دیوان ـــــ گستاخی معاف! میں رہنمائی چاہوں گا۔ ہم لوگ جو کہتے ہیں پاکستان میں جمہوری نظام پھلے پھولے۔ انہیں تشویش ہوتی کہ پچھلے دنوں المناک فسادات ہو گئے۔ ہمارے ہاں بھی ہوتے رہتے ہیں۔ وہ تو کوئی ایسی بات نہیں لیکن آپ کا ان کے بارے میں کیا خیال ہے۔؟

گورنر ـــــ وجوہات یہ ہیں۔ میرے خیال میں کہ ہمارے ہاں جمہوری دور آیا ہی نہیں تھا۔ پندرہ سال کی ایک بڑی زوردار آمریت کے نیچے لوگ دبے ہوئے تھے۔ اظہار کا موقع ملا۔ غلط اور صحیح کا فرق پتہ نہیں چلا۔ نئے نئے سرے سے جمہوریت کا دور چل رہا ہے۔ ہر چیز کو جمہوریت تصور کیا۔ حالانکہ جمہوریت دلائل و منطق مانگتی ہے۔ دلائل منطق چھوڑ کر جذبات کا راستہ اختیار کیا۔ اِس وجہ سے جو کچھ ہوا وہ لازمی بات تھی۔ میں نہیں کہتا کہ کوئی خاص وجہ ہے۔ لوگوں کے لئے مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ کیونکہ اس کے پیچھے ایسے عناصر بھی تھے جو گزشتہ الیکشن میں شکست کھا گئے تھے۔ انہوں نے ایسے طریقے اختیار کئے، لوگ جذباتی ہوتے ہیں ـــــ اِس کی وجہ سے یہ حالات بنے۔ حالانکہ بننے کی ضرورت نہیں تھی۔ بل میں آپ دیکھیں گے۔ کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ یہاں کے پریس کے تعاون کی ضرورت پڑے گی۔ ہمارے ہاں مختصر سے پرچے ہیں جن کی آپ انگلیوں پر نشان دہی کر سکتے ہیں جو آزاد اخبار کہلا سکتے ہیں۔ ورنہ عام طور پر اخبارات پر سرمایہ داری کا زیادہ اثر ہے۔ خبر کو اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں۔ میں تو کہوں گا کہ صحافت کی بجائے سنسنی خیز زرد صحافت پر اعتماد کرتے ہیں۔

دیوان ـــــ یہ تو مشترکہ بات ہے۔

گورنر ـــــ وہ تو خیر ہے ـــــ کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اب وہ معیاری ایڈیٹر نہیں ہیں۔ جیسے مولانا ابوالکلام آزاد کو کہہ سکتے ہیں۔ مولانا شوکت علی، محمد علی کو کہہ سکتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خان کو کہہ سکتے ہیں۔ ایسے صحافی ہمارے ہاں بھی موجود تھے ـــــ مجید لاہوری تھا ـــــ فخر ماتری تھا ـــــ ہمارے جو نئے لوگ ہیں وہ ایک خاص نقطۂ نگاہ سے اور ایک عینک سے تمام چیزوں کو دیکھ سکتے ہیں حالانکہ ایسی عینک ہونی چاہیئے جس سے آدمی دیکھ سکے کہ کیا مسائل ہیں۔ کیا تکالیف ہیں۔ کیا پریشانیاں ہیں۔ میں نہیں سمجھتا۔ اب جو تھوڑی بہت مشکلات درپیش ہیں۔ وہ دور نہ ہو سکیں گی۔ کیونکہ ہم ایک ہی مذہب کے لوگ ہیں۔ ایک ہی خدا کو۔ ایک رسُول اور ایک ہی قرآن کو ماننے والے ہیں۔ ہمارا صوبہ واحد صوبہ ہے جس نے مہاجرین کا خیر مقدم کیا ہے۔ کسی صوبے میں اتنی بڑی تعداد نہیں ہے مہاجرین کی۔ اگر میں تو ہم زبان ہیں۔ ہم زبان نہ ہونے کے باوجود بھی اس طرح خیر مقدم کیا ہے لوگوں کا، حالانکہ یہ تو سکیم بھی نہیں تھی پارٹیشن کے زمانے میں۔

دیوان ـــــ جی ہاں بالکل ہجرت کی سکیم تو نہیں تھی۔

گورنر ـــــ لیکن ہجرت نے جو شکل اختیار کی اِس کے بعد تو یہی تھا کہ ان کا خیر مقدم کیا جائے۔ یہ صوبہ تو ہمیشہ سے کرتا آیا۔ بہار میں فسادات ہوئے تو یہاں بہار کالونی بنادی گئی۔ بہاریوں کو پناہ دی گئی۔ بہاریوں کو لاکر بسادیا گیا۔ یہ تو بات نہیں۔ لوگوں نے اپنے طور پر کافی کچھ کیا۔ لیکن یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ بداعتمادی باقی رہی۔ اب کوشش جاری رہی تو وہ بھی رفع ہو جائے گی۔

دیوان ـــــ جمہوری دور میں جیسا کہ آپ نے فرمایا کہ یہ تو ہوتی ہے۔ ہم تو اس مرحلے سے گزرے بھی ہیں۔ اِس سے پہلے ہی وہاں بھی پنجاب میں اور بمبئی میں اس قسم کے واقعات ہوئے۔ میر صاحب مجھے یہاں دو مطالبات سننے میں آئے جو میں نے اخبارات میں دیکھے۔ ایک تو علیحدہ کراچی صوبے کا ہے۔

گورنر ـــــ دیکھئے یہ تو بالکل unnatural (غیر قدرتی) سی بات ہے۔ یہ علاقہ صدیوں سے ایک رہا ہے۔ مشرقی پاکستان جانے کے بعد پاکستان اتنا متحمل نہیں ہے کہ وہ اور مزید صوبے بنائے۔ اور اس میں اتحاد و یگانگت نہیں ہو، اور کسی شکوہ شکایت کا سبب بنے۔ یہ تو خطرناک صورت ہو گی پاکستان کے لئے ایک اور صوبہ بنے اور وہ بھی نفرت کی بنیاد پر ملک کو فائدہ بھی نہیں پہنچے گا۔ فائدہ اسی میں ہے کہ جو قدرتی سرحدیں ہیں وہی باقی رہیں اور کوئی اتنی بڑی وجہ بھی نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے کراچی کو علیحدہ کیا جائے۔

دیوان ـــــ ایک اور مطالبہ یہ ہے کہ اِس صوبے کو دو لسانی بنا دیا جائے۔

گورنر ـــــ ایک صوبے کی یہ صدیوں پرانی زبان ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا اِس میں کس قسم کی تکلیف ہے۔ اردو کو ہم ویسے ہی قومی زبان مان رہے ہیں۔ اردو کا ایک جائز مقام ہے۔ یہ رابطے کی زبان ہے۔ یہ اتنی خوب صورت ہے، اس میں اتنی جاذبیت ہے، اتنا حسن ہے کہ یہ اپنے لئے راہ ہموار کر سکتی ہے۔ اِس میں ایک وسیع خزانہ ہے علم کا لٹریچر کا۔ اس میں ہر طرح سے گنجائش ہے۔ سندھی صرف اِس صوبے تک محدود ہے۔ وہ اپنے صوبے میں ہے۔ اردو کو ہر صوبے میں یہ اہمیت حاصل ہے۔ میں نہیں سمجھتا۔ اس میں کسی قسم کا جھگڑا ہو۔ یہ تنازعہ ہے ہی نہیں۔ تنازعہ ختم کیا جا چکا ہے۔

دیوان ـــــ میر صاحب! دوسرا مسئلہ تھا جس سے ہمارے دونوں ملک گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ عوام خاص طور پہ ـــــ پچھلے دنوں بھٹو صاحب نے زرعی اصلاحات کا اعلان کیا۔ آپ کے صوبے

اخبارات پر سرمایہ داروں کا قبضہ ہے

میں اس کی نوعیت خاصی اہم ہے۔ کیونکہ یہاں بڑی بڑی زمینداریاں موجود ہیں ـــــ اس کو آپ کس طرح سے طے کر رہے ہیں۔

گورنر ـــــ جو زمین مل رہی ہے اس کو ہاریوں میں تقسیم کرنا ہی ہے۔ میرے خیال میں حکومت پہلے ہی ہاریوں کو زمین دے رہی ہے۔ پھر اور جو زمینیں مختلف ہاریوں میں تقسیم ہونا ہیں ان کا عام نیلام بند کر دیا ہے کہ اس ہاری تک پہنچ سکے جو خود اسے کاشت کرتا ہے۔ کوئی غیر حاضر زمیندار قبضہ نہ کرنے پائے۔ آپ کو علم ہے کہ سیاست میں کوئی چیز حرفِ آخر نہیں ہوتی ہے۔ یہ بتدریج ہم تجربات کر رہے ہیں۔ اِس میں مزید بھی گنجائش ہے۔ ہر دور میں اصلاحات ہوتی ہیں۔ یہ کوئی آخری اصلاحات نہیں ہیں۔ اصلاحات اور بھی شکل اختیار کر سکتی ہیں۔ جیسے جیسے ملک کی ضروریات ہوں گی۔ جیسے جیسے حکومت کو ضرورت درپیش ہو گی اجتماعی طور پر اسی طرح یہ کوشش کریں گے کہ ملک کے مسائل حل ہوتے رہیں۔

دیوان ـــــ آپ کے خیال سے تقریباً کتنی زمین ہو گی جو ہاریوں میں تقسیم ہو سکے گی۔

گورنر ـــــ میرے خیال میں اِس میں ۱۰ لاکھ ایکڑ ہے۔ چار لاکھ ایکڑ بلکہ چھ لاکھ ایکڑ زرعی اصلاحات میں ملی ہے۔ چار پانچ لاکھ ایکڑ اور ہے۔

باقی صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ فرمائیں

شیخ صاحب
ہم آپ کے دوست اور بھٹو کے دشمن ہیں

”لندن میں جیلانی کی پوشیدہ بیماری کا علاج شراب سے ہو رہا ہے“

* * * * *

لندن کا ایک دُکان دار پاکستانی سیاستدانوں کی کمزوریوں سے واقف ہے

الفتح رپورٹ

تحریک استقلال کے جنرل سیکرٹری ملک غلام جیلانی نیپ کے رہنماؤں کی طرح ان دنوں لندن کے دورے پر ہیں۔ جبکہ ”لندن پلان“ کے سلسلے میں ان کا نام بار بار آیا تھا، ان کے مرشد اصغر خان نے پُرزور الفاظ میں تردید کی تھی کہ ”جیلانی کا لندن پلان سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ ہی اس سلسلے میں وہ شیخ مجیب یا کسی دوسرے پاکستانی رہنماؤں سے ملے ہیں“۔ ملک غلام جیلانی کی حمایت میں اصغر خان کی گواہی کے بعد عوام کا شبہ کسی حد تک زائل ہو گیا تھا کہ جس شخص کے ریس میں گھوڑے دوڑتے ہوں وہ یقیناً پاکستان دشمنی میں اس حد تک دور نہیں جائے گا۔ کم از کم پاکستان سے اپنے معاشی مفادات کی وابستگی کا خیال ضرور رکھے گا۔ لیکن لندن میں ملک غلام جیلانی کی تازہ ترین سیاسی سرگرمیوں نے عوام کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ شراب کی لت اور ریس کا چسکا آدمی کو اس حد تک بگاڑ دے گا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

ملک غلام جیلانی پچھلے ایک ماہ سے لندن میں ”پوشیدہ بیماری“ کے علاج کے بہانے گلچھرے اڑا رہے ہیں۔ ایک پنتھ دو کاج کے مصداق کبھی لندن اور کبھی سوئٹزرلینڈ میں چوری چھپے شیخ مجیب سے ملاقاتیں کیں۔ خفیہ مذاکرات میں حصہ لیا — اور ”بنگلہ بندھو“ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا — ”یا شیخ ہم بھٹو کو چین سے بیٹھنے نہ دیں گے۔ بچے کھچے پاکستان کا بیڑا غرق کریں گے۔“

گزشتہ دنوں لندن میں مقیم ایک پُراسرار پاکستانی دوکان دار نے جس کا نام محمد اقبال بتایا جاتا ہے۔ جیلانی صاحب کو شراب کی دعوت پر بلایا۔ یہ دوکاندار پاکستانی سیاست دانوں، اخبارات کے مالکان اور بعض سماجی شخصیتوں کی کمزوریوں سے بخوبی واقف ہے۔ دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنے میں ماہر تسلیم کیا جاتا ہے۔ دعوت کا اہتمام بھی اس طور پر کرتا ہے۔ شراب، ریس، کلب، مُجرا اور گوری چٹی پنڈے والی میمیں — جیلانی صاحب کی دو بڑی کمزوریوں سے کون واقف نہیں۔ ریس اور شراب ان کی زندگی کا منتہا ہے۔ شراب اور گھوڑ دوڑ میں حصہ لینے کا نشہ سارے نشے پر بھاری ہے۔ سیاسی

کیمبر کیا وہ ان دونوں پر اپنی جان تک نچھاور کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ چنانچہ پاکستانی دوکاندار محمد اقبال کے بلاوے پر کچے دھاگے سے بندھے اُس کی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ شراب سے سجی ہوئی میز دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ ویسے جیلانی صاحب کوئی گرے پڑے آدمی نہیں ہیں کہ لوگ انہیں ندیدہ سمجھ لیں۔ لیکن وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اگر شراب زیادہ ہو، اعلیٰ ہو اور مفت کی ہو تو پھر تکلف کرنے والا آدمی شراب کی توہین جیسے ”عظیم جرم“ کا مرتکب ہوتا ہے۔ چنانچہ طرح طرح کی ولایتی وسکیوں سے سجی ہوئی میز پر نچھاور ہو گئے۔ اور کچھ اس انداز سے نچھاور ہوئے کہ عینی شاہدوں کے مطابق باہر کھڑی ہوئی گاڑی تک پہنچے نہیں پہنچائے گئے۔ انہیں اس عالم میں دیکھ کر لندن کے بڑے بڑے پیکڑوں نے اپنے دونوں کان پکڑ لئے۔ بھلا دوسروں میں یہ حوصلہ، یہ تاب اور یہ مجال کہاں جو اپنے ملک صاحب میں ہے۔ آخر ٹھہرے پاکستان کے جید سیاست دان اور وہ بھی ایسے ویسے نہیں۔ یحییٰ خان کو کرارا جواب دینے پر معتوب ہوئے تھے۔ مسٹر بھٹو کو پاکستان کا جائز صدر تصور نہیں کرتے اور دوسری تمام ”اسلام پسند پارٹیوں“ سے متحدہ محاذ بنا کر پاکستان کو ایک خالص ”اسلامی ریاست“ میں تبدیل کرنے کی قسم کھا رکھی ہے — انہیں اصغر خان کا ”سیاسی گائیڈ“ بھی کہا جاتا ہے — جبھی تو اصغر خان ایک سعادت مند شاگرد کی طرح ان کے خلاف دشمنوں کی طرف سے اُڑائی ہوئی افواہوں کی پُرزور الفاظ میں تردید کرنے کی مشق کرتے رہتے ہیں۔

لندن میں قیام کے دوران ملک صاحب کمبرلین ہوٹل میں فی الوقت قیام پذیر ہیں جہاں نیپ کے چند ممتاز رہنما بھی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ پاکستانی دوکاندار ملک صاحب کی خدمت گزاری میں بطورِ خاص مصروف ہے، ملک صاحب کے دشمنوں نے یہاں تک اڑا رکھی ہے کہ اکثر رات گئے تک ان کے کمرے میں نسوانی قہقہوں کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ کبھی کبھی ”انگریزی“ میں بے ساختہ چیخیں بھی سنائی دیتی ہیں — یہ ہوٹل کیسا ہے، اس میں کس قسم کا کاروبار ہوتا ہے، اس کے بارے میں پوری تفصیل ایک پاکستانی فلمی اداکار سے دریافت کی جاسکتی ہے، جس کا نام فی الوقت صیغۂ راز میں رکھنے کی ضمانت ہم سے پہلے لی گئی ہے۔

پاکستانی دوکان دار، جس کا نام اور خدمات کا ذکر اوپر بار بار آچکا ہے۔ شاید پاکستان کے عوام کے لئے زیادہ مانوس نہ ہو لیکن پاکستانی اخبارات کے بیشتر مالکان اس تاجر سے بخوبی واقف ہیں۔ ان مالکان میں "زندگی" اور "اردو ڈائجسٹ" کے قریشی برادران سرفہرست ہیں۔ اگر اسلام پسند پرچوں کے روحِ رواں اعجاز حسن قریشی سے اس تاجر کے بارے میں حقائق معلوم کئے جائیں تو شاید وہ اپنی اندرونی چوٹیں سہلا کر بہت سے رازوں سے پردہ ہٹا دیں ــــ اُس کے پاس چند پاکستانی رسائل کی ایجنسی بھی ہے۔ مال منگوا کر مکر جانا اُس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پچھلے دنوں جب اردو ڈائجسٹ (پابندی سے قبل) کی رقم بڑھ گئی تو قریشی برادران کو یہاں آنا پڑا۔ دوکان دار شاطر آدمی ہے اور اپنے لوگوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ جو شراب نہیں پیتے انہیں کلبوں کی سیر کراتا ہے۔ اگر اس سے بھی کام نہیں چلتا تو پھر "ولایتی حوروں" کے دہکتے بدنوں سے کام نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ قریشی برادران سے اس نے بلوں کی ادائیگی کے معاملے میں جس خوبصورتی سے چھٹکارہ حاصل کیا آپ سن کر حیران رہ جائیں گے۔ غریبوں نے محض شرافت اور اپنے کاروباری حالات کے پیشِ نظر خاموشی اختیار کرلی۔ اگر شور شرابا کرتے تو بڑی تھُو تھُو ہوتی۔

ایک ذمہ دار شخص نے بتایا کہ مذکورہ بدنام دوکان دار اور اردو ڈائجسٹ کے ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی ایک رات یہاں کے مشہور کلب "عمر خیام" میں گئے۔ ان لوگوں نے کئی گھنٹوں تک قیام کیا۔ عمر خیام میں "بیلے ڈانس" ہوتا ہے۔ اس کلب میں بیشتر لڑکیاں عرب ہیں۔ اس شاطر تاجر نے ایک عرب ڈانسر کا تعارف اپنے مہمان خصوصی سے کرایا۔ ڈاکٹر صاحب ماشاء اللہ فرفر عربی بولتے ہیں۔ جی کھول کر رقاصہ سے عربی میں باتیں کیں۔ باتوں کے دوران وہ اس قدر محو ہو گئے کہ انہیں خبر نہ ہوئی کہ تاجر کے اشارے پر ایک فوٹو گرافر نے ان کی تصویر اتالی۔ اب یہ تصویر پاکستان کے اس "ممتاز تاجر" کے پاس بطور یادگار محفوظ ہے۔ جس کی خاطر اُس نے عمر خیام کا ۶۰ پونڈ کا بل ادا کیا تھا۔ دوسرے دن ڈاکٹر صاحب نے اس سے زندگی اور اردو ڈائجسٹ کے بلوں کی وصولی کی بات چھیڑی تو اس نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ ڈاکٹر صاحب کو سخت طیش آیا۔ انہوں نے پولیس کا دھونس دیا۔ تو اس نے اپنی جیب سے عمر خیام والی تصویر نکال کر سامنے رکھ دی اور اس رات کا ذکر کچھ ایسے دل نشین انداز میں کیا کہ ڈاکٹر صاحب کی پیشانی عرق آلود ہو گئی ــــ اُس نے مزید دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"اگر آپ نے چوں چراں کی تو یہ من موہنی تصویر جس میں آپ لہک لہک کر عرب دوشیزاؤں سے گفتگو فرما رہے ہیں۔ پاکستانی اخبارات میں چھپوا دی جائے گی"۔

پاکستانی تاجر کی اس دھمکی کے بعد ڈاکٹر صاحب لگے گلے زمین میں دھنس گئے۔ نگاہیں نیچی کئے چند لمحے بیٹھے رہے۔ پھر شرمندہ شرمندہ اٹھے، اور دوسرے ہی دن بڑی پُراسرار حالت میں پاکستان روانہ ہو گئے۔

پاکستانی تاجر پہلے سیاسی پھڈوں میں اپنی ٹانگ نہیں اڑاتا تھا۔ مگر یحییٰ خان کے زوال کے بعد سے یہ لندن میں ایکٹو ہو گیا۔ اور یہاں سیاسی جمگھٹوں میں اکثر و بیشتر نظر آنے لگا۔ پاکستان سے آنے والے ہر سیاست دان کو پہلی فرصت میں اپنے یہاں مدعو کرتا ہے۔ ان کی "توفیق" کے مطابق خاطر و مدارات کرتا ہے۔ جہاں اُس نے ملک غلام جیلانی کی خدمت کی وہاں اس نے حامد سرفراز کو بھی مایوس نہیں کیا۔ حامد سرفراز کو تو لندن کی رنگین شاموں میں غرق کر دیا۔ شراب کی ایک پارٹی میں حامد سرفراز نے جھوم کر ایک اخبار نویس سے کہا ــــ "بھائی کچھ بھی ہو ہم نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ بھٹو کا جنازہ نکال کر ہی دم لیں گے"۔

لندن میں ہونے والے تمام سیاسی چکروں کے روحِ رواں محمود ہارون ہیں۔ گزشتہ دنوں فون پر ایک اخبار نویس سے گفتگو کرتے ہوئے کہا۔ "بھائی میں تو وطن واپس جا رہا تھا۔ لیکن ابھی راستے ہی میں تھا کہ صدر بھٹو کا بیان آگیا۔ "ایک بھائی امریکہ میں چکر چلا رہا ہے اور دوسرا بھائی لندن میں" صدر بھٹو کا یہ بیان دیکھتے ہی میں راستے سے واپس آگیا۔ بھلا آپ ہی بتایئے جس خاندان نے پاکستان بنانے میں نمایاں حصہ لیا اور اس تحریک میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ بھلا وہ ملک کیخلاف کیسے ہو سکتا ہے"۔ محمود ہارون نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ خود صدر بھٹو نے اپنا ایک ایلچی (میاں انور علی) کو لندن بھیجا۔ انہوں نے فون کر کے میرے بھائی کو نیویارک سے یہاں بلوایا اور کہا بھائی خدا کے لئے مجیب سے ملو اور اسے راضی کرو ــــ میاں انور علی کے کہنے پر ہم دونوں بھائی شیخ مجیب سے ملے اور ان سے کہا ــــ "آخر ہم بھائی تھے۔ اب جب کہ بنگلہ دیش بن ہی گیا ہے۔ تو آپ پاکستان سے بات چیت کیوں نہیں کرتے"۔

اس پر مجیب نے جواب دیا ــــ "صدر بھٹو اب تک بنگلہ دیش کو پاکستان کا حصہ سمجھتے ہیں۔ اگر ان کا یہی اصرار ہے تو انہیں چاہیئے کہ مغربی پاکستان کا اقتدار بھی میرے حوالے کر دیں۔ اگر صدر بھٹو ایک پاکستان پر ایمان رکھتے ہیں تو ہمارے اور ان کے تعلقات اسی وقت خوش گوار ہوں گے جب وہ بنگلہ دیش کو تسلیم کر لیں گے"۔ محمود ہارون نے کہا کہ ہم نے میاں انور علی کو شیخ مجیب کے جواب سے آگاہ کر دیا۔ اس پر انہوں نے کہا: "میں اس کا جواب کل تک دوں گا"۔ دوسرے دن انہوں نے کہا۔ "بھائی آپ مجیب سے ملتے رہیے اور ان سے کہیں کہ وہ ضد چھوڑ دیں" ــــ محمود ہارون نے کہا۔

"آپ ہی بتائیں اس میں ہارون خاندان کا کیا قصور ہے۔ اب ہمیں بلا وجہ لندن پلان میں ملوث کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے"۔ اس نمائندے نے ان سے سوال کیا۔ "آپ عطاء اللہ مینگل سے بھی ملیں۔ انہوں نے جواب دیا۔ "بھائی وہ میرے عزیز دوست ہوتے ہیں۔ ان سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اب تو وہ ہسپتال میں داخل ہو گئے" ــــ محمود ہارون نے خان ولی خان سے ملاقات کی تردید کی۔

ہارون برادران کے چیلے چانٹے ٹرک لین میں آباد ہیں۔ کہنے کو تو وہ پاکستانی ہیں۔ لیکن ان کی حرکتیں ایسی ہیں کہ دوسرے پاکستانی ان کے کارنامے سن کر شرمسار ہو جاتے ہیں۔

دولتانہ نے پاکستانی سفارتخانے کو کونسل مسلم لیگ کا دفتر بنا دیا

محمود ہارون لندن میں پاکستانی سفارت خانے سے مسلسل رابطہ قائم رکھتے ہیں۔ کونسل مسلم لیگ کے سربراہ سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہے۔ ان دنوں یہاں پاکستان کا سفارتخانہ کم اور کونسل مسلم لیگ کا دفتر زیادہ بن گیا ہے۔

میاں ممتاز دولتانہ جہاں کہیں مدعو ہوتے ہیں ان کی تقریر کا آغاز مسلم لیگ اور اختتام جمہوریت پر ہوتا ہے۔ اپنے ملک کے سفیر سے زیادہ وہ کونسل مسلم لیگ کے سفیر بن گئے ہیں۔ ان کا یہ انداز لندن میں مقیم پاکستانیوں کے لئے سوہانِ روح بن گیا ہے۔





’بھارت بھٹو کی بجائے مجھ سے معاملہ کرے‘

بھٹو ≡ دوسرے راجہ داہر ہیں

چارسدہ کے ایک سجے سجائے آرام دہ کمرے میں نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ ولی خان نے ہندوستان اسٹینڈرڈ کلکتہ کے نمائندے کو انٹرویو دیا۔ یہ انٹرویو ایسے وقت میں دیا گیا جب بھارت اور پاکستان دوطرفہ معاہدے کے تحت اپنی اپنی فوجیں مقبوضہ علاقوں سے واپس بلانے والے تھے۔ اس انٹرویو میں خان عبدالولی خان نے جن خیالات کا اظہار کیا اس سے ان کی وطن دوستی اور حب الوطنی کا پردہ چاک ہوگیا۔ ہم ذیل میں ان کا انٹرویو پیش کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ ولی خان بھارت اور پاکستان کے درمیان خوش گوار تعلقات کی راہ میں مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کو سب سے بڑی رکاوٹ تصوّر کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے حالیہ انٹرویو میں کہا۔ ”مسٹر بھٹو پر کوئی شخص اعتماد نہیں کرسکتا۔ بھارت ایک ایسے آدمی پر کس طرح اعتماد کرسکتا ہے جو بھارت سے سو سال تک جنگ لڑنے کی وکالت کرتا ہے۔ مسٹر بھٹو پر نہ تو شیخ مجیب الرحمان اعتماد کرسکتے ہیں اور نہ ہی بنگلہ دیش ——

صوبائی خودمختاری کے سلسلے میں مسٹر ولی خان نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر صوبوں کو مکمل خودمختاری نہ دی گئی تو ملک میں تشدد کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوگا۔ بنگلہ دیش کا وجود اسی وجہ سے عمل میں آیا کہ اُسے خودمختاری دینے سے انکار کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں بنگلہ دیش کے وجود نے دو قومی نظریے کا خاتمہ بالخیر کر دیا۔ اس کے باوجود بنگلہ دیش اور پاکستان کے عوام ایک بار پھر بھائیوں کی طرح مل کر رہیں گے —— نیپ کے رہنما نے ایک سوال کے جواب میں خود کو مسٹر بھٹو کا نعم البدل قرار دیا۔

سوال:۔ شملہ معاہدے کے بارے میں آپ کے ذاتی تاثرات کیا ہیں۔؟

جواب:۔ ہم نے اس معاہدے کو خوش آمدید کہا۔ نیپ اس ملک کی واحد پارٹی ہے جو بھارت، افغانستان اور ایران سمیت تمام پڑوسی ملکوں سے تعلقات معمول پر لانے کی وکالت کرتی رہی۔ یہ ہم ہی لوگ ہیں کہ بہانگِ دہل تمام فوجی معاہدوں سے نکل آنے کا نعرہ لگاتے رہے۔ اس لئے کہ ہم بڑی طاقتوں کی سیاست میں ملوث ہونا نہیں چاہتے۔

ہم تمام بین الاقوامی مسائل دوطرفہ گفت وشنید کے ذریعہ حل کرنے کے حامی ہیں۔ سیاسی مسائل کا حل سیاسی طریقہ سے نکالنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرقی پاکستان، میرا مطلب ہے ”بنگلہ دیش“ کی کشمکش کے دوران ہم نے کہا کہ اس مسئلے کو گفت وشنید کے ذریعہ حل کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بنیادی طور پر یہ مسئلہ بھی سیاسی تھا۔

ہم اس بات کے حامی ہیں کہ تمام چھوٹے بڑے ممالک اپنے مسائل کو میز پر بیٹھ کر پُرامن طریقہ سے حل کرنے کی کوشش کریں۔ اس لئے جہاں تک نیپ کا تعلق ہے۔ ایسا کوئی تضاد موجود نہیں ہے کہ ہم شملہ معاہدے کو خوش آمدید نہ کہہ سکیں —— البتہ مسٹر بھٹو کے لئے اس میں کچھ مشکلات درپیش ہوں گی۔ کیونکہ یہ وہی شخص ہیں جو بھارت سے ہزار سال تک جنگ کرنے اور گنگا جمنا کا رنگ تبدیل کرنے کا دعویٰ کیا کرتے تھے۔ مسٹر بھٹو نے کھیل کو سیاست میں ملوث کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ بھارت کی ہاکی ٹیم کو پاکستان کی مقدس سرزمین پر کھیلنے کی اجازت نہ دیں گے۔ ذاتی طور پر میں اور میری پارٹی نے ہمیشہ اس بات کی وکالت کی کہ بھارت سے بہتر اور خوش گوار تعلقات بنائے جائیں۔

سوال: اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے کہ مسٹر بھٹو جو پاکستان کے سربراہ ہیں، ان کے دور میں بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کے خوش گوار تعلقات کے قیام کی راہ میں دشواریاں پیش آئیں گی۔؟

جواب:۔ مسٹر بھٹو ہفت رنگ خوبیوں کے مالک ہیں۔ ایک ایسا آدمی جو بھارت سے ہزار سال تک جنگ کرنے کا اعلان کرتا رہا ہو۔ اگر وہ بھارت کی موجودہ قیادت کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو یہ بات مسٹر بھٹو کی کامیابی میں شمار ہوگی۔ کسی بھی سیاسی مسئلے پر ان کے خیالات میں ثبات نہیں ہے وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ بالکل صحیح کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں یہ بات اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ شیخ مجیب ان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ میں ”مشرقی بنگال“ میں ان سے بہت قریب تھا اور فوجی کارروائی سے دو دن قبل ڈھاکہ سے روانہ ہوا تھا۔

میں یہ بات اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ ہر بنگالی اور ہر پاکستانی یہ سمجھتا ہے کہ یحیٰی خان تمام سیاسی معاملات مسٹر بھٹو اور خان قیوم کے مشورے سے انجام دیا کرتے تھے۔ آخر وہ لوگ ان پر کس طرح اعتماد کر سکتے ہیں۔ ہ مسٹر بھٹو نے حکومت تشکیل دی اور مسٹر قیوم خان کو حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دیدی۔ ان سب چیزوں نے ان کی راہ کو دشوار بنا دیا جب وہ شیخ مجیب سے بات چیت کرنے جائیں گے۔ کیونکہ بنگالی عوام یہ سمجھتے ہیں کہ مشرقی بنگال میں جو کچھ ہوا اس کے برابر کے ذمہ دار یہی دو افراد ہیں۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ مسٹر بھٹو نے جنرل گل حسن کو ہٹا کر جنرل ٹکہ خان کو افواج کا سربراہ بنا دیا جو بنگالیوں میں ”بنگلہ دیش“ کے قصاب کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا بنگلہ دیش ان پر کبھی اعتماد نہیں کر سکتا۔

جہاں تک بھارت کا تعلق ہے مجھے نہیں معلوم کہ وہ ان پر اعتماد کرتا ہے یا نہیں۔ مگر دونوں معاہدے کی دستاویزات تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اگر وہ بھارتیوں کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پاکستان کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہوگی۔ لیکن مسٹر بھٹو کو جو بھارت سے ہزار سال تک جنگ لڑنے کا دعوے کرتے ہیں شملہ اسپرٹ کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔ کیا یہ بات ان کے لئے مشکل ترین نہیں کہی جاسکتی۔؟

بیرونی ممالک کے علاوہ خود ان کے اپنے ملک کے عوام کے ساتھ مشکلات پیش آرہی ہیں۔ کیا وہ ان پر اعتماد کر سکتے ہیں؟ کیونکہ ہر مسئلے پر چاہے وہ بھارت، روس، بنگلہ دیش یا امریکہ ہو ان کی رائے تیزی سے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ سیٹو، سنٹو جیسے فوجی معاہدوں کے بارے میں بھی وہ ماضی کی طرف لوٹ گئے ہیں۔

گزشتہ چھ ماہ کے دوران ہم نے ہر مسئلے پر ان کا سیاسی چہرہ دیکھ لیا۔ غیر ملکی کے علاوہ اُس ملک کے عوام ان پر مزید اعتماد نہیں کر سکتے۔

گزشتہ چھ ماہ کے دوران وہ اپنے ملک کے عوام سے بے شمار چیزوں کے وعدے کر رہے ہیں۔ کھیت اُس کا ہے جو ہل چلائے، رکشہ رکشہ چلانے والوں کو دے دیے جائیں گے۔ کارخانے مزدوروں کے ہیں اور دکانیں دوکانداروں کی ہیں —— لیکن اب عوام نے محسوس کر لیا کہ وہ اس معاملے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ وہ

مسٹر بھٹو کی تصویر دس ہزار روپے میں بھی دستیاب نہیں ہو سکتی

اپنے وعدوں پر قائم نہیں رہے۔ لہٰذا اب وہ عوام کا اعتماد کھو بیٹھے ہیں۔ عالمی طاقتیں بھی ایک ایسے آدمی پر کیسے بھروسہ کر سکتی ہیں۔؟

سوال :۔ کیا آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان میں ان کی مقبولیت ختم ہو رہی ہے۔ کراچی اور لاہور کے چند ممتاز صحافیوں نے مجھے بتایا ہے کہ سندھ میں لسانی تنازعہ کے بعد مسٹر بھٹو کی سندھ اور پنجاب میں مقبولیت ختم ہو گئی ہے۔

جواب :۔ ہاں — بالکل — اب زبان کا مسئلہ ہی لیجیے، بنگالی اور پٹھان قدیم ثقافتی ورثے کے مالک ہیں۔ اُردو بہت تلخ حالات میں پاکستان آئی۔ یہ تحریک پاکستان کی علامت ہے۔ تقسیم کے بعد بھارت سے یہاں آنے والے دراصل اِس زبان کے محافظ ہیں۔ اب اردو یہاں کے بہت سے مقامی لوگوں کی مادری زبان بن چکی ہے۔ اُردو سرکاری زبان ہے اور پورے پاکستان میں مقبول ہے۔ مثال کے طور پر میں بلوچی نہیں بول سکتا۔ یہاں تک کہ کسی بلوچی سے بھی اردو میں بات چیت کرتا ہوں۔ اُردو رابطہ کی زبان ہے مسٹر بھٹو کی سیاست ہمیشہ عوام میں غیر معمولی توقعات پیدا کرنے کی سیاست ہے۔ انہوں نے پاکستان کے غریب عوام کو ہر قسم کی امیدیں دلائی تھیں۔ انہوں نے سندھیوں کو بھی غیر معمولی امیدیں دلائیں راجہ داہر کے پانچ ہزار سال بعد ایک دوسرا بادشاہ آیا ہے۔ انہوں نے میرے ایک دوست سے کہا تھا کہ وہ راجہ داہر کی سلطنت کو وسعت دیں گے۔ راجہ داہر دریائے ستلج تک اپنی سلطنت کو وسعت دے سکا تھا جبکہ ان کی حکمرانی افغانستان کی سرحد تورخم تک ہے۔ وہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ ایک سندھی حکمران پاکستان کے تخت پر براجمان ہو چکا ہے۔ سندھی سمجھتے ہیں کہ ان کے پاس راجہ داہر موجود ہے۔ اِس لئے وہ جو چاہے کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے زبان کا بل تھوپ دیا اور اِسی حکمران نے آئندہ بارہ سال تک کے لئے سندھ میں اردو قائم رکھنے کے انتظامات بھی کر دیئے۔ انہوں نے اُردو بولنے والوں کو بھڑکایا اور سندھیوں کو بھی مایوس کیا۔ سندھی اِس بات کو خوب اچھی طرح محسوس کرتے ہیں کہ مسٹر بھٹو آئندہ بارہ سال تک پاکستان کے صدر نہیں رہیں گے جب کہ اردو سندھ میں موجود رہے گی۔ لہٰذا اس بات نے انہیں سخت مایوس کر دیا ہے؟ وہ اِس بات سے بھی خوف زدہ ہیں کہ اردو بولنے والوں کی اکثریت کراچی میں آباد ہے۔ اور بالآخر وہ ان سے اردو بولنے والوں کے لئے علیحدہ صوبے کا مطالبہ کریں گے۔ جس شاؤلسٹ طریقہ سے سندھ میں یہ کھیل کھیلا گیا۔ اِس کا لازمی ردِعمل پنجاب میں ہونا تھا۔ پنجابی اپنے آپ کو پاکستان کا متولی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جب کبھی پاکستان کی بنیادوں پر حملہ ہوتا ہے چاہے وہ دو قومی نظریہ ہو یا اردو زبان وہ اس کا تحفظ کرنا اپنا مقدس فرض سمجھتے ہیں — زبان کے مسئلے پر سندھ اور پنجاب میں مسٹر بھٹو اپنی مقبولیت کھو بیٹھے ہیں مجھے ایک غیر ملکی رپورٹر نے بتایا ہے کہ دس ہزار روپے خرچ کر کے بھی آپ مسٹر بھٹو کی کوئی تصویر حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی ساری تصاویر جلا دی گئیں۔

سوال :۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مسٹر بھٹو ملک میں جمہوریت بحال کر دیں گے۔؟

جواب :۔ ملک میں عام انتخابات اور ایک فرد ایک ووٹ کے سلسلہ میں یحیٰی خان کو کریڈٹ جاتا ہے۔ مسٹر بھٹو جیسی تیسی جمہوریت کو بھی ختم کرنا چاہتے ہیں۔ جب تک ہم دباؤ نہیں ڈالیں گے وہ ملک میں جمہوریت بحال نہیں کریں گے۔ اگر ان کے بس میں یہ بات ہوتی تو شاید وہ اب تک ملک میں مارشل لاء برقرار رکھتے۔ ملک میں ہنگامی صورت حال موجود نہیں، مگر ابھی تک بنیادی حقوق بحال نہیں کئے گئے وہ بنیادی حقوق سلب کرنے کے بعد آگے قدم اٹھا رہے ہیں۔ پریس کی آزادی کو کچل دیا گیا۔ پہلا شکار پریس کو بنایا گیا۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور پریس ٹرسٹ ایک شخص کو پروجکٹ کر رہے ہیں۔

سوال :۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ نئے دستور میں پیپلز پارٹی اور صدر بھٹو پاکستان کے صوبوں کو خود مختاری دے دیں گے۔؟

جواب :۔ وہ شاید ایسا نہیں چاہتے، مگر انہیں صوبوں کو خود مختاری دینی ہوگی۔ اس سلسلے میں دو اہم نکات ہیں۔ مشرقی پاکستان اس لئے ہاتھ سے نکل گیا کہ اُسے خود مختاری نہیں دی گئی۔ ون یونٹ کے نفاذ سے پندرہ سال تک چھوٹے صوبوں کا استحصال کیا گیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ون یُونٹ کے دوران ہمارا سیاسی اور اقتصادی استحصال کیا گیا۔ اگر کسی نے اِس قسم کے استحصال کو جاری رکھنے کی کوشش کی تو چھوٹے صوبوں کے عوام سختی سے مزاحمت کریں گے۔ ہم نے واضح کر دیا ہے کہ مرکز کے پاس صرف تین چیزیں رہنی چاہئیں امورِ خارجہ، کرنسی اور دفاع۔ بقیہ تمام چیزیں صوبوں کے کنٹرول میں رہنی چاہئیں۔ اگر یہ حق نہیں دیا گیا تو چھوٹے صوبوں کے عوام اپنا سر نہیں جھکائیں گے۔ اب برتری کو کوئی برداشت نہیں کرے گا۔ لہٰذا مسٹر بھٹو اِس بات کو پسند کریں یا ناپسند انہیں ان مطالبات کو تسلیم کرنا ہوگا۔

سوال :۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان مسائل پر کوئی سمجھوتہ ہو تو بھارت اور پاکستان کو کشمیر کے مسئلہ پر تصفیہ کرنا چاہیئے۔

جواب :۔ جی ہاں — ہماری پارٹی کشمیری عوام کے حق خود اختیاری کو تسلیم کرتی ہے۔ کشمیر کا مسئلہ گزشتہ ۲۵ برسوں سے متنازعہ بنا ہوا ہے۔ اب نئے حالات پیدا ہو چکے ہیں۔ بنگلہ دیش میں جو واقعات رونما ہوئے۔ انہوں نے صورتِ حال کو یکسر تبدیل کر دیا ہے۔ حق خود اختیاری کے اصولوں کے مطابق کشمیریوں کو فیصلہ کرنا ہوگا۔

پاکستان کا بنیادی تصور اس بات پر ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی اور ایک قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ مشرقی پاکستان میں کیا ہوا — وہ مغربی پاکستان کے مسلمان ہی تھے۔ جنہوں نے مشرقی پاکستان میں پہنچنے کے بعد مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کے لئے تکلیف دہ حالات پیدا کر دیئے۔ اور مشرقی پاکستان کے مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں کو ظلم و تشدد سے نجات حاصل کرنے کے لئے نام نہاد ہندو انڈیا میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ مسلمان بھائی نے مسلمان بھائی کا خون بہایا۔ مسلمان بھائی نے اپنے مسلمان بھائی کی بہن کی عصمت کو تار تار کیا۔ ان تلخ واقعات نے بنیادی تصور کو مکمل طور پر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ حق خود اختیاری کے سوال کو ان واقعات کے پس منظر میں بھی دیکھنا ہوگا۔ اب بچے کھچے پاکستان میں ایک کشش پیدا کرنی ہوگی۔ جیسا کہ اکثر میں اپنی تقریروں میں کہتا رہا ہوں کہ کیا نیا دستور کشمیری عوام کو اپنی جانب مائل کرنے میں کامیاب ہوگا۔؟ کیا کشمیر پاکستان کے ان دو صوبوں کے حالات دیکھنے کے بعد جہاں پیپلز پارٹی کی حکومت نہیں ہے۔ پاکستان کا پانچواں فیڈرل یونٹ بننے پر تیار ہو جائے گا۔ مرکزی کابینہ میں سرحد اور بلوچستان کو کوئی نمائندگی نہیں دی گئی۔ کیا اس انتظامی طریقہ کار سے کشمیری عوام کی حوصلہ افزائی ممکن ہے۔؟

سوال :۔ کیا آپ بنگلہ دیش کے عوام کو کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں۔؟

جواب :۔ یہ میری بدقسمتی رہی کہ میرے گزشتہ دو دوروں کے دوران وہاں کے حالات سنگین تھے پہلی مرتبہ مشرقی پاکستان طوفان اور سیلاب کی زد میں تھا اور دوسری مرتبہ سیاسی طوفان میں پھنسا ہوا تھا۔ جب چند پاگل جنرل اور پاگل سیاست دان سیاسی مسائل کو بندوق کی گولیوں سے حل کر رہے تھے۔ جب کہ دنیا بھر کے مہذب عوام سیاسی مسائل کو سیاسی طریقہ سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ زبردست تباہی ہوئی۔ میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ ملک کے اِس حصے میں ان سے ہمدردی رکھنے والے بے شمار لوگ ہیں۔ جو پاگل جنرلوں اور پاگل سیاست دانوں کے خلاف ہیں۔ بالخصوص نیپ۔

ہمیں بھی نقصان اٹھانا پڑا۔ کیونکہ ہم نے پاگل پن کی حمایت نہیں کی۔ ہماری پارٹی پر اس لئے پابندی لگا دی گئی کہ ہم نے فوجی جنتا کی اور مشورہ دینے والے سیاست دانوں کی حمایت نہیں کی۔ ہماری تمام تر ہمدردیاں بنگلہ دیش کے عوام کے ساتھ تھیں۔ فی الوقت ہماری نیک تمنائیں ان کے ساتھ ہیں۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا ہم اس کی مذمت کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب ہم دونوں بھائیوں کی طرح ملیں گے۔

الفتح

اُتے بادی تھلے پٹواری



رپورٹ پٹواری مفصل ہے

قدرت اللہ شہاب

میرے سامنے چھ درخواستوں کا پلندہ پڑا ہے۔ یہ درخواستیں عیدو ولد غنی کی ہیں۔ عیدو نے یہ عرضیاں درجہ بدرجہ جناب گورنر صاحب، وزیر اعلیٰ، وزیر بحالیات، فنانشل کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کے نام لعبینہ رجسٹری ارسال کی تھیں۔ ان سب درخواستوں کا مضمون واحد ہے۔

جناب عالی ——

بصد ادب گزارش ہے کہ، فدوی ضلع انبالہ کا مہاجر ہے۔ موضع موہن ماجرا تحصیل روپڑ میں فدوی کے پاس دس ایکڑ اراضی چاہی وبارانی تھی۔ فدوی نے کلیم فارم داخل کئے تھے۔ لیکن وہ کسی دفتر میں پس وپیش ہو گئے۔ فدوی نے عذرداری کی ہوئی ہے۔ لیکن ابھی تک سنٹرل ریکارڈ آفس سے جواب نہیں آیا۔ فدوی نے مثلی کلیم فارم بھی دیتے ہوتے ہیں۔ لیکن ابھی تک کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔

موضع روڈو سلطان تحصیل شورکوٹ میں فدوی کو ۱۳ ایکڑ متروکہ اراضی عارضی طور پر الاٹ ہوئی تھی فدوی چار سال سے اس پر قابض ہے اور فصل کاشت برداشت کر رہا ہے۔ فدوی لگان بھی باقاعدگی سے ادا کرتا رہا ہے۔ لیکن اب پٹواری حلقہ بہ طمع نفسانی یہ زمین اپنے ایک قریبی عزیز کو الاٹ کر رہا ہے جناب عالی، اگر فدوی کی الاٹمنٹ ٹوٹ گئی تو فدوی کا خاندان فاقوں سے مر جائے گا۔ فدوی کا کوئی اور ذریعہ معاش نہیں ہے۔ فقط کھیتی باڑی پر گذارہ ہے۔ لہذا التماس بحضور انور یہ ہے کہ فدوی کا عارضی رقبہ تا تصفیہ عذرداری بحال رکھا جائے، تاکہ فدوی اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکے۔ فدوی تازیست حضور انور کی جان و مال کو دعائیں دے گا۔

العبد

عیدو ولد غنی سابق سکنہ موہن ماجرہ تحصیل روپڑ ضلع انبالہ

حال مقیم :

موضع روڈو سلطان تحصیل شورکوٹ۔ ضلع جھنگ

دولت خداداد پاکستان زندہ باد۔

لاٹ صاحب، وزیر اعلیٰ، وزیر مہاجرین، فنانشل کمشنر اور کمشنر کے دفاتر سے یہ درخواستیں یکے بعد دیگرے ڈپٹی کمشنر کے پاس "برائے مناسب کارروائی" آ گئیں۔

ڈپٹی کمشنر کے مسلخوان نے ان سب درخواستوں کو اکٹھا کیا۔ اور ان پر حسب ضابطہ نوٹ لکھا۔ "درخواست ہا ہذا الطلب رپورٹ بخدمت جناب افسر مال صاحب مرسل ہوں۔" ڈپٹی کمشنر نے تیز رفتار مشین کی طرح اس نوٹ پر اپنے دستخط ثبت کر دیئے اور پھر یہ درخواستیں مال افسر صاحب کی خدمت میں جا پہنچیں۔

افسر مال صاحب نے حکم لکھا: "درخواست ہذا الطلب رپورٹ بخدمت جناب تحصیلدار صاحب مرسل ہوں۔"

تحصیل دار صاحب نے فرمایا: "درخواست ہذا الطلب رپورٹ بخدمت جناب نائب تحصیل دار صاحب مرسل ہوں۔"

نائب تحصیل دار صاحب نے لکھا۔ "درخواست ہا ہذا الطلب رپورٹ بنام قانون گو علاقہ مرسل ہوں۔"

قانون گو صاحب نے حکم دیا۔ "درخواست ہا ہذا الطلب رپورٹ بجانب پٹواری حلقہ ہذا مرسل ہوں۔"

ع :۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

چنانچہ ایک جگہ سے دوسری جگہ، دوسری جگہ سے تیسری جگہ مرسل ہوتے ہوتے یہ سب درخواستیں بالآخر اسی پٹواری کے پاس لطلب رپورٹ پہنچ گئیں جو عیدو ولد غنی کے الاٹمنٹ کو "بہ طمع نفسانی" منسوخ کرنے کے در پے ہے۔

پٹواری صاحب نے چھ کی چھ عرضیوں کو بنڈل بنا کے اپنے رجسٹر میں نتھی کیا اور ہفتہ عشرے کے انتظار کے بعد ازرہ فرض شناسی عیدو کو طلب کیا۔

جب عیدو حاضر ہوا تو پٹواری صاحب نے اس کی درخواستوں کا پلندہ رجسٹر سے برآمد کر کے اُس کے منہ پر دے مارا۔ عیدو کی آنکھیں فرط حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ جناب لاٹ صاحب، جناب وزیر اعلیٰ، جناب وزیر مہاجرین، جناب فنانشل کمشنر، جناب کمشنر بہادر اور جناب ڈپٹی کمشنر بہادر کی بلند و بالا کرسیوں کو بے بسی کے عالم میں پٹواری کی چارپائی کے ساتھ بندھا دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔ اگر عیدو کو تصوّف کے ساتھ ذرا سا بھی مس ہوتا تو وہ "ہمہ اوست" کا نعرہ لگا کر پٹواری کے پاؤں پکڑ لیتا۔ لیکن پٹواری صاحب کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ انہوں نے عیدو کو کچھ مخصوص گالیوں سے نوازا اور اُسے گھر جا کر آرام سے سو رہنے کی تلقین کی۔

ایک مہینہ، دو مہینے، تین مہینے —— عیدو ہر دوسرے تیسرے روز تحصیل اور ضلع کے دفتروں میں جاتا اور وہاں سے گھڑکیاں، جھڑکیاں اور دھکے کھا کر بے نیل و مرام واپس آتا۔ کبھی کبھی وہ کسی وکیل کی وساطت سے مفید اطلاعات بھی حاصل کر لیتا تھا۔ سلیس زبان میں ان اطلاعات کا مفہوم یہ ہوتا تھا کہ تمہارے کاغذات پر مناسب کارروائی ہو رہی ہے۔ تم آرام سے گھر بیٹھ کر فیصلے کا انتظار کرو۔۔۔۔۔۔ اسی ہیرا پھیری اور مشوروں کی تلاش میں اس کے برتن اور بیوی کے زیور بھی بک گئے۔ اب بیلوں کی جوڑی کی باری تھی لیکن پٹواری صاحب نے بروقت فیصلہ کر کے عیدو کو اس افتاد سے بچا لیا۔

الفتح

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

پٹواری صاحب نے عیدو کی زمین منسوخ کر کے اُسے اپنے قریبی عزیز نور بخش کے نام تجویز کر دیا۔ اور اس تجویز کے کنفرم ہونے تک عیدو کی درخواستوں کو رجسٹر میں بڑی احتیاط سے ایک طرف نتھی رکھا۔ جب یہ ساری منزلیں بخیر و خوبی طے ہو گئیں تو انہوں نے اپنا فرضِ منصبی انجام دینے کے لئے عیدو کی درخواستوں پر اپنی رپورٹ تحریر فرمائی۔

جناب عالی ——

سائل مسمی عیدو کی جملہ درخواست ہذا کی مکمل پڑتال کی۔ ظاہر ہوا کہ سائل فضول درخواست دینے کا عادی ہے۔ اسے متعدد بار سرزنش کی جا چکی ہے کہ اس طرح حکامِ اعلیٰ کا قیمتی وقت ضائع کرنا درست نہیں۔ لیکن سائل اپنی عادت سے مجبور ہے۔ سائل کا چال چلن بھی مشتبہ ہے۔ اور اس کا اصلی ذریعہ معاش فرضی گواہیاں دینا ہے۔ مشرقی پنجاب میں اس کے پاس کوئی زمین نہ تھی۔ اسی وجہ سے اس کے کلیم فارم بھی ابھی تک تصدیق نہیں ہوئے۔ سائل نے دو مرتبہ عذرداری بھی کی لیکن بے سود۔ متعدد مہاجرین اور گواہان کے بیانات بھی قلم بند کئے گئے۔ تحقیق ہوا کہ مشرقی پنجاب میں سائل کی ملکیت میں کوئی زمین نہ تھی۔ چنانچہ کھیوٹ نمبر ۱۳، مقدمہ نمبر ۲۵ موضع روڈو سلطان میں تین ایکڑ متروکہ زمین جس پر سائل کا ناجائز قبضہ تھا اس کے نام سے منسوخ ہو کر مسمی نور بخش کے نام بروئیت قانون رائجہ باضابطہ کنفرم ہو چکی ہے۔ مسمی نور بخش ضلع ہوشیار پور کا مہاجر اور سابق سفید پوش ہے۔ اس کے مصدقہ کلیم فارم بھی موصول ہو چکے ہیں۔ چنانچہ موضع روڈو سلطان میں متروکہ اراضی ہذا الاٹ کر کے اس کی حق رسی کر دی گئی ہے۔ نیز آنکہ مسمی نور بخش نیک چلن اور باعزت مہاجر ہے۔ اور جملہ کارہائے سرکار میں ہر وقت مستعد و امدادی ہے۔ خاکسار کی رائے میں افسرانِ بالا کی خوشنودی اور موضع روڈو سلطان کی نمبرداری کا جائز طور پر مستحق ہے۔ رپورٹ ہذا برائے حکم مناسب پیش بحضور والا ہے۔"

گرداور اور قانون گو نے لکھا۔ "رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ برائے حکم مناسب بحضور جناب نائب تحصیل دار صاحب پیش ہو۔"

نائب تحصیل دار صاحب نے لکھا۔ "رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ برائے حکم مناسب بخدمت جناب تحصیل دار صاحب پیش ہو۔"

تحصیل دار صاحب نے لکھا: "رپورٹ پٹواری مفصل ہے، برائے حکم مناسب بخدمت صاحب مال افسر بہادر پیش ہو۔"

صاحب افسر مال بہادر نے لکھا۔ "رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ برائے حکم مناسب صدر میں پیش ہو۔"

صدر کے مسلخوان نے حکم لکھا: "رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ درخواست ہائے مسمی عیدو فضول ہیں۔ داخل دفتر کی جائیں۔ مسمی نور بخش کے کاغذات بوقت انتخاب نمبرداران برائے موضع روڈو سلطان صدر میں پیش کئے جائیں۔ تاکیدی احکامات برائے افسر مال جاری ہوں۔"

جناب ڈپٹی کمشنر بہادر نے اس حکم پر اپنے دستخط ثبت فرمائے —— اور اس طرح مسمیان عیدو اور نور بخش پر ضلع کے حاکم اعلیٰ کی سرکاری مہریں چسپاں ہو گئیں۔ یہ اور بات ہے کہ مہر نور بخش کی پیشانی پر لگی اور عیدو کی پشت پر ——

سیّد عبدالحمید عدمؔ



نظریات

شفا

تمہیں دیکھتے ہی — وہ پھر سے جی اٹھے گا
عدمؔ کو — جہاں موت آنے لگی ہے

سفر

پہنچا نہیں ابھی — کسی منزل پہ کبریا
جب سے رواں ہوا ہے — زمانہ سفر میں ہے

دولت

عدمؔ — ادا ہی تو دولت ہے، دلرباؤں کی
جو بیرخی نہ کرے — وہ پری جمال نہیں

ہرجانہ

خلق نے جس کا بھی — حصہ مارنا چاہا، اُسے
اُس کے حصے کی جگہ — ذاتِ خدا دیدی گئی

استدلال

تُو آئے گا — تجھے آنا پڑے گا مجبوراً
وہ اِس لئے — کہ مجھے انتظار ہے تیرا

افلاس

جو جز نصیحتوں کے — نہ کچھ اور دے سکیں
وہ لوگ اتفاق سے — کتنے غریب ہیں

تونگری

اے بادشاہ — کون تونگر ہے؟ تو کہ میں
تیرا نصیب — میری طبیعت امیر ہے

صاف بیانی

کیا کوئی دلکشی نہیں — میرے مکان میں؟
آتے ہی بیقرار ہو — جانے کے واسطے

نصیحت

دوسروں کو — یہی نصیحت دو!
خواہشوں کی کمی — بڑی شئے ہے

سلامت روی

آؤ بدنامیوں سے — اٹ جائیں
سوچنا — مرگِ شادمانی ہے

خداحافظ

مجھ کو نہ جا سپردِ خدا کر کے — سنگدل
اُس کی سپردگی میں — کوئی شادماں نہیں

غزل



فارغ بخاری

ستم گروں کی کسی بات میں صفائی نہیں
ندامتوں میں بھی اخلاص و بے ریائی نہیں

نہ جانے کیا یہ بے رنگیوں کا موسم ہے
کہ قاتلوں کا بھی دستِ ستم حنائی نہیں

جہاں میں ایسا کوئی مردِ حق نہیں جس نے
صداقتوں کے صلے میں صلیب پائی نہیں

ستم ہے وہ بھی اجالوں کے گیت گاتا ہے
کہ ایک شمع بھی جس نے کبھی جلائی نہیں!

نجانے کس قدر ایذا پسند لوگ ہیں یہ
ہیں زخم زخم، لبوں پر مگر دہائی نہیں!

وہ بادہ کش بھی ہے فارغ پیمبرِ دوراں
کہ جس نے عصمتِ لوح و قلم گنوائی نہیں!

خالد علیگ

قطعہ

رات لمبی سہی، سیاہ سہی
اپنی حالت ابھی، تباہ سہی
دَور جمہو آنے والا ہے
اور کچھ دن "جہاں پناہ" سہی

غزل

دریا کو دشت، دشت کو دریا کہا گیا
اس نامراد ملک میں کیا کیا کہا گیا

جن صورتوں پر زخم تھے جن سیرتوں پہ داغ
حد ہے کہ اُن کو انجمن آرا کہا گیا

فاقوں نے جس کو دم بھی نہ لینے دیا کبھی
وہ بدنصیب "عشق کا مارا" کہا گیا

لوگوں کو روشنی سے ڈرانے کے واسطے
سورج غریب، آنکھ کا اندھا کہا گیا

نئی غزل

اقبال ساجد

ہسپتالوں میں یہ کاروبار بھی کرنا پڑا
مجھ کو اپنے خون کا بیوپار بھی کرنا پڑا!

مستحق لوگوں میں بھی بانٹے ہیں ہیرے خون کے
کچھ مریضوں کیلئے ایثار بھی کرنا پڑا

چلتے پھرتے تھیٹروں میں ایک جوکر کی طرح!
ہنسنے رونے کا مجھے کردار بھی کرنا پڑا!

میں نے لوگو، اپنی سوچوں کی سمگلنگ آپ کی
جرم جب عاید ہوا، انکار بھی کرنا پڑا!

اپنی غزلوں کے تراشے جسم پر چپکا لئے
مشتہر خود کو سرِ بازار بھی کرنا پڑا

چائے کی پیالی پہ ہاں میں ہاں ملانی پڑ گئی
دوستوں میں خود کو برخوردار بھی کرنا پڑا

کیا کروں پتھر کو انجکشن لگانے پڑ گئے
وہ کہ بے حِس تھا، اُسے بیدار بھی کرنا پڑا

اک طرف حالات سے اور اِک طرف دشمن کیساتھ
خود کو لڑنے کے لئے تیار بھی کرنا پڑا!

ہائے جس دشمن نے پہنایا مجھے طوقِ شکست
اس کو سینے سے لگا کر پیار بھی کرنا پڑا!



یکم اکتوبر ۱۹۷۲ء کو چینی انقلاب کے بائیس سال پورے ہو رہے ہیں۔ ہم پاکستانی عوام کی جانب سے اپنے عظیم محسن اور دوست، چینی کمیونسٹ پارٹی، چیئرمین ماؤزے تنگ اور چینی عوام کو سلام کرتے ہیں۔ (ادارہ)



چین
منزل بہ منزل

وہاب صدیقی

- اکتوبر ۱۹۱۱ء میں ڈاکٹر سن یات سین کی قیادت میں جمہوریہ چین کا قیام عمل میں آیا۔ انقلاب اکتوبر ۱۹۱۱ء کے وقت ڈاکٹر سن یات سین امریکہ میں تھے۔ انہیں یکم جنوری ۱۹۱۲ء کو جمہوریہ چین کا پہلا صدر چنا گیا۔
- ۱۹۱۹ء میں چین کے انقلابی طلباء نے جنگ باز سرداروں، رجعت پسندوں اور جاگیرداروں کے خلاف زبردست مظاہرے کئے۔
- ۱۹۲۰ء میں چینی کمیونسٹ پارٹی قائم ہوئی۔ اس کا قیام چین کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔
- ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر سن یات سین کا انتقال ہو گیا۔ کومنتانگ فوج کا سرغنہ چانگ کائی شیک برسر اقتدار آیا۔ اُس نے چین کے جاگیرداروں اور جنگی سرداروں سے گٹھ جوڑ کر کے کمیونسٹوں کے خلاف محاذ بنایا۔ اس طرح کومنتانگ میں پھوٹ پڑ گئی۔
- اپریل ۱۹۲۷ء میں چانگ کائی شیک نے کمیونسٹوں کے خلاف اعلانیہ فوجی کارروائی کی شنگھائی میں سینکڑوں افراد کو دار پر لٹکا دیا گیا۔ ہزاروں کے سر تلوار سے کاٹ دیئے گئے اور ہزاروں افراد کو پابند سلاسل کر دیا گیا۔ بورودین اور ڈاکٹر سن یات سین کی بیوہ ماسکو فرار ہو گئی۔
- کمیونسٹوں نے چیئرمین ماؤزے تنگ کی قیادت میں سخت مزاحمت کی۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں کینٹن پر قبضہ کر لیا۔ لیکن دو دن کے بعد ہی گوریلا جنگ کی حکمت عملی کے تحت کینٹن چھوڑ دیا گیا۔ چانگ کائی شیک اور جنگی سرداروں نے کمیونسٹوں کی حمایت کرنے والوں سے اس طرح انتقام لیا کہ صرف ایک دن میں چھ ہزار افراد کے خون سے ہاتھ رنگے۔ لاشوں کو چھکڑوں میں بھر بھر کر شہر سے باہر لے جایا گیا۔
- ستمبر ۱۹۳۱ء میں جاپانی جنگ باز حکمرانوں نے منچوریا پر حملہ کر دیا۔ کومنتانگ کی حکومت اور چینی جنگی سرداروں نے مزاحمت نہ کی۔ اُن کا یہ کردار اُن کے طبقاتی کردار کا مظہر تھا۔ البتہ چینی عوام نے چینی کمیونسٹ پارٹی کے سُرخ پرچم تلے جاپانی حملہ آوروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔
- ۱۹۳۱ء میں چیئرمین ماؤزے تنگ کی قیادت میں چینی سوویت جمہوریہ قائم ہوئی۔ چینی کمیونسٹ پارٹی نے جاپانی جارحیت کے خلاف چانگ کائی شیک اور جنگی سرداروں سے تعاون اور اتحاد کی اپیل کی جسے انہوں نے مسترد کر دیا۔
- اکتوبر ۱۹۳۳ء میں جرمن فوجی مشیر جنرل ہنر کے مشورے پر چانگ کائی شیک نے چار لاکھ فوج کے ساتھ سوویت حکومت پر حملہ کر دیا۔ اِس حملے میں تقریباً دس لاکھ افراد ہلاک و زخمی ہوئے۔ اِس حملے نے چینی

سوویت کو یوشان چھوڑنے اور شمالی چین میں نیان کی طرف جانے پر مجبور کر دیا۔

- ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو تین لاکھ چینی حریت پسند یوشان سے نیان کی جانب روانہ ہوئے۔ ان کی قیادت چیئرمین ماؤزے تنگ کر رہے تھے۔ اس سفر میں بے سروسامانی کا عالم یہ تھا کہ گنتی کے چند گھوڑے تھے۔ خوراک اور پانی کی سخت قلت تھی۔ اسلحہ ناقص اور تعداد میں بہت کم تھا۔ دوسری جانب چانگ کائی شیک کی فوج جدید ترین اسلحہ سے لیس تھی۔ اس کی فوجیں مسلسل ان کا تعاقب کر رہی تھیں۔ ہوائی جہاز بمباری کرتے تھے، جگہ جگہ دشمن سے نبرد آزما ہونا پڑتا تھا۔ اس سفر میں ایسے بھی مرحلے آئے جب حریت پسندوں کو گھاس کھانی پڑی۔ برف کو گھول گھول کر پانی بنانا پڑا اور بعض اوقات پانی کی بجائے گھوڑوں کا پیشاب پینا پڑا۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں جب یہ قافلہ اپنی منزل ـــــ شمالی شنسی پہنچا۔ تو صرف تیس ہزار افراد اس کے ساتھ تھے۔ ۲ لاکھ ۷۰ ہزار افراد موت کی آغوش میں سو چکے تھے۔ چیئرمین ماؤزے تنگ کی قیادت میں لانگ مارچ تاریخ انسانی کا ایک عظیم اور ناقابل فراموش واقعہ ہے۔ عظیم قیادت کے عظیم عزم اور بے مثال فراست کی مثال ہے۔ لانگ مارچ میں پورے دو سال (اکتوبر ۱۹۳۴ء سے اکتوبر ۱۹۳۶ء) کا عرصہ صرف ہوا۔ بارہ ہزار پانچ سو کلو میٹر کا فاصلہ طے کیا گیا۔ کل گیارہ صوبوں سے گزرنا پڑا۔ متعدد دریاؤں، پہاڑوں، گھاس کے میدانوں اور دلدلی علاقوں کو عبور کرنا پڑا۔ لانگ مارچ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں پورے دو سال کے بعد صوبہ شمالی شنسی میں ختم ہوا۔ اس مارچ کے دوران جنوری ۱۹۳۵ء میں مشہور زون ای کانفرنس ہوئی جس میں ماؤزے تنگ کو کمیونسٹ پارٹی کا چیئرمین اور چواین لائی کو نائب چیئرمین منتخب کیا گیا۔
- ۱۹۳۵ء میں جاپانیوں نے صوبے ہوپیہ پر قبضہ کر لیا اور اپنی پٹھو چینی حکومت قائم کر دی۔ اس حکومت نے شمالی چین کو جنوبی چین سے علیحدہ کرنے کا مطالبہ کر دیا۔
- اکتوبر ۱۹۳۶ء میں جاپان نے منگولیا پر دھاوا بول دیا۔
- ۱۹۳۷ء میں جاپان نان کنگ پر قابض ہو گیا۔ اُس نے حسب روایت عوام کے خون سے ہولی کھیلی۔ قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا۔ صرف دس دن میں نان کنگ کی آبادی گیارہ لاکھ سے گھٹ کر ڈھائی لاکھ رہ گئی۔
- ۱۹۳۷ء میں جاپانی جارحیت کے خلاف کمیونسٹ پارٹی اور کومنتانگ حکومت نے متحدہ محاذ بنایا۔ متحدہ محاذ کا قیام چین کی تاریخ کا اہم واقعہ ہے۔ چیئرمین ماؤ نے ہدایت کی کہ "متحدہ محاذ میں کمیونسٹوں کو پہل اور اپنی آزادی برقرار رکھنی چاہیئے اور ہر کام متحدہ محاذ پر نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ اس محاذ کی قیادت کمیونسٹ پارٹی کے ہاتھوں میں ہونی چاہیئے" چنانچہ چانگ کائی شیک سے جو متحدہ محاذ بنایا گیا اس کی قیادت کمیونسٹ پارٹی کے پاس تھی۔ چیئرمین ماؤ کے بتائے ہوئے گوریلا جنگ کے اصولوں اور حکمت عملی پر عمل کیا گیا۔ اور چینی عوام نے پندرہ سال کی طویل جدوجہد کے بعد جاپانی جنگ بازوں کو اتنی عبرتناک شکست دی کہ اسے پورے ایشیا پر قبضہ کرنے کے خواب ہی سے خوف آنے لگا۔
- ۱۹۴۷ء میں شمالی شنسی کی مہم شروع ہوئی۔ جس نے چانگ کائی شیک کو تائیوان میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اور چینی عوام نے اس کے چنگل سے آزادی حاصل کر لی اور ۳۰ لاکھ ۴۴ ہزار مربع میل کے رقبہ پر پرولتاریہ ریاست نمودار ہوئی۔
- یکم اکتوبر ۱۹۴۹ء کو عوامی جمہوریہ چین کے قیام کا اعلان کیا گیا۔ اس کا اعلان کرتے ہوئے چیئرمین ماؤزے تنگ نے کہا "چین کی قسمت عوام کے ہاتھوں میں ہے۔ چین مشرق کے اُبھرتے ہوئے سورج کی مانند ہے۔ اس کی کرنیں ملک کے کونے کونے کو منور کر دیں گی۔ عوام، رجعت پسند، عوام دشمن حکومت کے باقیات کو مٹا دیں گے۔ جنگ کی تباہیوں کا ازالہ کر دیں گے اور ایک نئی طاقتور اور ترقی یافتہ عوامی جمہوریت کی تعمیر کریں گے۔" لیکن سامراجی ممالک نے اُسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ امریکی سامراج نے چانگ کائی شیک کے تائیوان کو چین کی حقیقی ریاست قرار دے کر عوامی جمہوریہ چین کو اقوام متحدہ کا رکن نہیں بننے دیا۔
- ۱۹۵۰ء میں شمالی کوریا اور جنوبی کوریا میں جنگ شروع ہو گئی۔ امریکی سامراج نے جنوبی کوریا کی عوام دشمن پٹھو حکومت کی بھرپور امداد کی۔ چین نے یہ جنگ شروع ہونے کے چار ماہ بعد اپنے رضا کار شمالی کوریا بھیج دیئے۔ ان رضا کاروں میں چیئرمین ماؤ کے صاحبزادے بھی شامل تھے۔ وہ اس جنگ میں شہید ہو گئے۔ یہ جنگ تین سال جاری رہی۔
- ۱۹۵۰ء میں چین نے اپنے تاریخی اور ناقابل تنسیخ حصے تبت پر قبضہ کر لیا۔
- ۱۹۵۱ء میں اقوام متحدہ میں چین کی شمولیت کو جنرل اسمبلی نے ۲۶ ووٹوں کی اکثریت سے مسترد کر دیا۔
- ۱۹۵۸ء میں زیادہ اور بھرپور پیداوار کے لئے چیئرمین ماؤزے تنگ نے "گریٹ لیپ فارورڈ" کا اعلان کیا۔
- ۱۹۶۰ء میں اقوام متحدہ میں عوامی جمہوریہ چین کی نمائندگی کے مخالفین کی تعداد گھٹ کر آٹھ رہ گئی۔
- ۱۹۶۱ء میں چین اور سوویت یونین کے نظریاتی اختلافات کھل کر سامنے آ گئے۔ عوامی جمہوریہ چین نے "نئے سوویت زاروں" کی مذمت کرنی شروع کر دی۔ ترمیم پسندی کی سخت مخالفت کی اور امریکی روسی گٹھ جوڑ کا پردہ چاک کرنا شروع کیا۔
- ۱۹۶۲ء میں عوامی جمہوریہ چین اور بھارت میں سرحدی جھڑپیں شروع ہوئیں۔ اس موقع پر پاکستانی عوام کے دشمن اور رسوائے زمانہ آمر ایوب خان نے چین کے خلاف بھارت کو مشترکہ دفاع کی پیشکش کی اور "شمال سے خطرے" کا نعرہ لگایا۔
- ۱۹۶۴ء میں چین نے پہلا ایٹمی دھماکہ کیا۔
- ۱۹۶۴ء میں فرانس نے عوامی جمہوریہ چین کو تسلیم کر لیا۔
- ۱۹۶۵ء میں اقوام متحدہ میں چین کی نمائندگی کے سلسلے میں زبردست مقابلہ ہوا۔ چین کی حمایت میں ۴۷ اور مخالفت میں ۴۷ ووٹ آئے۔ ۲۰ ممالک غیر جانبدار اور تین غیر حاضر رہے۔
- ۱۹۶۶ء میں لیوشاؤچی کے ترمیم پسندانہ اور انقلاب دشمن نظریات پر قابو پانے کے لئے "عظیم پرولتاری ثقافتی انقلاب" برپا کیا گیا جو ۱۹۶۹ء تک جاری رہا۔ اس کے نتیجے میں "ریڈ گارڈز" کی تنظیم اُبھر کر سامنے آئی۔ یہ عظیم پرولتاری ثقافتی انقلاب "تاریخ انسانی میں اپنی نوعیت کا واحد انقلاب ہے۔ جس میں عوام کو بلا امتیاز تمام حکام پر تنقید کرنے کی اجازت دی گئی۔ چیئرمین ماؤزے تنگ نے کہا کہ

باقی صفحہ ۲۶ پر ملاحظہ فرمائیں

چین میں عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دیئے گئے ہیں



ریحانہ ادریس

مولانا ابوالکلام آزاد کے مطابق

"قوموں کی اجتماعی زندگی کا مرکزی لفظ عورت ہے۔ اس کی زندگی سے ہم سوسائٹی کی اجتماعی حالت کا اندازہ کر سکتے ہیں، عورت انسانی سوسائٹی کی نبض ہے۔ قومی مزاج کا پورا حال اس کی نبض پر انگلی رکھنے سے آشکار ہو جاتا ہے۔ عورت قوموں کی سعادت و شقاوت کا آئینہ ہے۔ وہ پوری قوم کو اپنے وجود میں پیش کرتی ہے۔"

عوامی جمہوریہ چین کی اجتماعی زندگی اور معاشرہ کا اندازہ چینی عورتوں کی زندگی سے لگایا جا سکتا ہے، کیونکہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد "عورت انسانی سوسائٹی کی نبض ہوتی ہے اور پوری قوم کو اپنے وجود میں پیش کرتی ہے۔"

چین میں انقلاب سے قبل بالکل ایسے ہی حالات تھے جیسے اس وقت پاکستان میں پائے جاتے ہیں۔ وہاں بھی خواتین کو ایک غیر پیداواری قوت شمار کیا جا سکتا تھا۔ لیکن پھر صدر ماؤزے تنگ نے یہ نظریہ پیش کیا کہ "مرد اور عورت نے ان دو جنسوں کے درمیان حقیقی مساوات صرف سماج میں سوشلسٹ تبدیلی کے دوران ہی حاصل ہوتی ہے۔" چنانچہ جب چین میں انقلاب آیا اور چینی کمیونسٹ پارٹی اور چینی عوام نے پرانے استحصالی طبقوں اور لوٹ کھسوٹ کے نظام کو ختم کیا تو سب سے پہلے انہوں نے اپنے آئین میں عورتوں کو سیاسی، معاشی، ثقافتی، سماجی اور گھریلو زندگی میں مردوں کے برابر حقوق کی ضمانت دی۔

معاشی اور سیاسی جدوجہد کے ذریعے چین میں نظام ملکیت کے لحاظ سے سوشلسٹ تبدیلی بنیادی طور پر مکمل ہو چکی ہے۔ پچھلے انقلابی ادوار کی خصوصیت کی حامل عوام کی وسیع پیمانے کی شدید طبقاتی جدوجہد بنیادی طور پر ختم ہو چکی ہے۔ پرانا فرسودہ نظام دم توڑ چکا ہے۔ چنانچہ چین کی لاتعداد عورتیں خوشی کے ساتھ مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کے لئے آگے بڑھ رہی ہیں لیکن کچھ خواتین ایسی بھی تھیں جنہوں نے گھروں میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ "جب مرد کام کریں گے تو گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔"

کیو کوتی ینگ پیکنگ میں ایک کپڑے کی مل میں ویور Weaver ہے۔ اس نے اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا کہ "بہت سی عورتوں کے ذہن پرانے سماج کے جاگیردار اور متوسط طبقے کے خیالات سے زہر آلود تھے۔ اور وہ یہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ کس قسم کے حقوق اور رتبہ کی حق دار ہیں۔"

لیکن آزادی اور خود مختاری تو ایک ایسی خوشبو ہے جو کوچہ بہ کوچہ پھیلتی چلی جاتی ہے۔ گھر میں رہنے والی یہ عورتیں بچوں کی نرسریوں کی دیکھ بھال کرتیں اور اپنے شوہروں کو آرام پہنچانے کی غرض سے صبح سے رات تک مصروف رہتیں۔ انہوں نے اپنے آس پاس دیکھا اور محسوس کیا کہ دوسری عورتیں مختلف قسم کے دوسرے کاموں میں مصروف ہیں۔ ان کے تعلقات اپنے شوہروں سے بھی بہتر تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ جوش اور ولولہ کے ساتھ اپنے ملک میں سوشلزم کی عظیم تعمیر میں حصہ لے رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر گھر ان کو قید خانہ محسوس ہوا۔ دوسری طرف چیئرمین ماؤزے تنگ ان پر وقتاً فوقتاً زور دیتے رہتے تھے کہ "اب وقت بدل گیا ہے۔ آج مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔ جو کام مرد کامریڈ انجام دے سکتے ہیں وہ عورتیں بھی کر سکتی ہیں۔"

چین میں آج عورتیں ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں۔ ان میں وہ کام بھی شامل ہیں جو روایاتی طور پر مردوں کے لئے مخصوص تھے۔

پچھلے سال عوامی فوج آزادی کا ایک دستہ چین کی ایک بڑی مصروف بندرگاہ پر پہنچا تاکہ گیہوں کو جہاز سے تیزی سے اتارنے میں کارکنوں کا ہاتھ بٹائے، کیونکہ اناج کی شدید ضرورت تھی۔ انکا استقبال

کرنے کے لئے کارکن آگے بڑھے۔ اس مہم کی نائب ڈائرکٹر ایک بیس سالہ نوجوان لڑکی تھی۔

شمال مشرقی چین کی ایک سخت روایت یہ تھی کہ سمندر صرف مردوں کے لئے مخصوص تھا۔ ماہی گیری کا کام صرف مرد کر سکتے تھے اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ کام صنفِ نازک کے بس کا نہیں ہے۔ لیکن اب ہر موسم بہار میں ماہی گیری کے لئے دریائے زرد اور دریائے پوہائی میں جانے والی کشتیاں جو ڈیزل سے چلتی ہیں اور جن کی رفتار ساٹھ میل فی گھنٹہ ہے، عورتیں چلاتی ہیں۔

۸ مارچ دنیا بھر کی محنت کش عورتوں کا دن ہے۔ یہ دن ان عظیم عورتوں کی یاد میں منایا جاتا ہے جنہوں نے سب سے پہلے پرانی روایات کو توڑا اور گھر سے باہر کام کرنے نکل کھڑی ہوئیں۔ آج جہاز پر کپتان، فرسٹ اور سیکنڈ مددگار، انجن روم مکینک، ونچ آپریٹر، ریڈیو آپریٹر حتیٰ کہ پولیٹیکل انسٹرکٹر ساری کی ساری عورتیں ہیں۔

۱۹۵۸ء میں اٹھارہ سالہ وِن شوچِن اور اس کی دوسری تین ساتھیوں نے سب سے پہلے سمندر میں جانے کی اجازت مانگی۔ اگرچہ پارٹی نے ان کی ہمت افزائی کی۔ لیکن سارے گاؤں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ان کا مذاق اڑایا گیا لیکن لڑکیوں کی ہمت پست نہیں ہوئی۔ انہوں نے کہا "عورتیں بے بس لولی لنگڑی نہیں ہیں اس لئے ہم ضرور سمندر میں جائیں گے۔" یہ کوئی آسان کام نہیں تھا تجربہ کار ماہی گیروں سے تربیت حاصل کرنے میں طویل عرصہ لگا۔ ۱۹۶۲ء میں ان لڑکیوں نے ماہی گیری شروع کی۔ جب یہ ۵۰۰ ٹن مچھلیاں پکڑ کر گاؤں میں داخل ہوئیں تو مردوں کا ریکارڈ ٹوٹ گیا اور گاؤں بھر کا مذاق کبھی نہ ختم ہونے والی تعریف میں بدل گیا۔

"عورت کا مقام گھر میں ہے" یہ ایک بہت پرانی روایت ہے۔ اس روایت کو توڑنا شاید سب سے مشکل کام تھا۔ ۱۹۶۰ء میں شنگھائی کے ورکر سیکشن میں رہنے والی سات ان پڑھ گھریلو عورتوں نے اس روایت کو توڑنے میں پہل کی۔ ایک دن پڑوسیوں نے دیکھا کہ وہ اپنے گھریلو استعمال کی اشیاء مثلاً میز کرسی، استری، سلائی مشین وغیرہ اٹھا اٹھا کر گلی کی ایک چھوٹی سی عمارت میں جمع کر رہی ہیں جو ان کو میونسپل پارٹی کمیٹی نے دی تھی۔ لوگوں کے سوالوں کا انہوں نے بس ایک ہی جواب دیا کہ "ہم اپنی فیکٹری شروع کرنے والے ہیں"۔ یہ صورتِ حال ان کے شوہروں کے لئے بھی بدحواسی اور پریشانی لے کر آئی۔ انہیں خدشہ تھا کہ کام سے واپس آکر رات کا کھانا تیار نہیں ملے گا۔ ان کے کپڑے بغیر دھلے پڑے ہوں گے اور بچے بھوت بنے پھر رہے ہوں گے۔ مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا۔

ان عورتوں نے گھریلو مسائل پر بڑی خوب صورتی اور مضبوطی سے قابو پا لیا۔ انہوں نے اپنے شوہروں کو یہ یاد دلایا کہ عورتیں اور مرد دونوں برابر ہیں۔ انہوں نے گھریلو مسائل پر برابری کے اصول کی بنیاد پر حصہ لینے پر زور دیا۔ لہٰذا مردوں کے آرام اور بڑائی کے دن جو عورتوں کی بدولت ان کو میسر تھے ختم ہو گئے۔ آہستہ آہستہ مردوں نے عورتوں کا ساتھ دینا سیکھ لیا۔ اب وہ گھریلو کاموں میں ان کی مدد کرتے ہیں۔ بچوں کے لئے کنڈرگارٹن اور نرسری کا انتظام ہے۔ اس طرح سارے گھریلو مسائل بڑی خوش اسلوبی سے طے ہو گئے۔

اس زمانے میں دوکانوں میں پلاسٹک کے چھوٹے چھوٹے پرس دستیاب نہیں تھے۔ چنانچہ ان عورتوں نے ان کو بنانے کا منصوبہ بنایا۔ میونسپل پارٹی کمیٹی نے ان کو پلاسٹک دینا چاہا لیکن عورتوں نے کسی قسم کی مدد لینے سے انکار کر دیا۔ اور کہا: "ہم صرف اور صرف اپنے آپ پر انحصار کریں گے"۔ حکومت چاہتی تھی کہ وہ پلاسٹک فرٹلائزر بیگ بنائیں۔ انہوں نے حکومت سے مشین نہیں مانگی بلکہ انہوں نے اپنی مدد کے لئے چند ریٹائرڈ کارکنوں کو آس پاس سے ڈھونڈ نکالا تاکہ کام کی رفتار بڑھانے کے لئے وہ ان کی مدد کریں۔ یہ عورتیں لکھ اور پڑھ نہیں سکتی تھیں۔ یہ کمزوری اُن کے آڑے وقت کام آئی۔ اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ مختصر مدت کی کلاسوں میں جانا شروع کر دیا اور اس طرح فیکٹری ترقی کرتی رہی۔

۱۹۶۸ء میں ان کو سب سے بڑے چیلنج کا مقابلہ کرنا پڑا جب حکومت نے ان کو برقی صنعت کے لئے controll able silicon hectrifiers بنانے کے لئے کہا۔ انہوں نے تجربہ کار کارکن حاصل کئے تاکہ وہ انہیں یہ کام کرنا سکھائیں۔ ریٹائرڈ کارکنوں کو اپنی مدد کے لئے بلا لیا۔ ان عورتوں نے یہ آدھ بیکار مال سے بنایا۔ ۱۹۷۰ء کے آخر میں انہوں نے اعلیٰ درجے کے ...... ارکٹی فائر بنائے جن کی مالیت تقریباً ......،۳ ڈالر تھی۔ ۱۹۷۱ء میں تیار شدہ رکٹی فائر کی تعداد ایک لاکھ تھی۔ آج ایک معمولی سادہ سے پلاسٹک پرس بنانے والی فیکٹری جسے سات ان پڑھ گھریلو عورتوں نے شروع کیا تھا۔ ایک بڑی فیکٹری میں تبدیل ہو چکی ہے۔ جس میں اس وقت چھ سو عورتیں کام کر رہی ہیں۔ ان عورتوں کی اوسط عمر ۴۲ سال ہے۔ سب سے زیادہ معمر عورت ساٹھ سال کی ہے۔ یہ سب عورتیں شادی شدہ اور کئی بچوں کی مائیں ہیں۔

ان عورتوں نے اس قول کو سچا کر دکھایا "جو کام مرد کر سکتے ہیں وہ عورتیں بھی کر سکتی ہیں"۔

اگر پاکستانی عورتوں میں ملک کے استحکام اور خوش حالی کے لئے کام کرنے کے جذبات پیدا کئے جائیں۔ آزاد اور مختار رہنے کے نظریہ کو پھیلایا جائے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ ہر قسم کی تکالیف کو برداشت کرے۔ تن من دھن سے ملک کی تعمیر میں لگ جائیں۔

پاکستان کے موجودہ سرمایہ دارانہ معاشرہ میں خواتین باہر نکلیں گی تو انہیں ہر قسم کے حوصلہ شکن حالات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ کیونکہ اس استحصالی نظام میں خواتین کا کوئی مقام نہیں۔ یہ صورتِ حال بہت اندوہناک ہے۔ ہمیں ان کٹھن اور مشکل حالات سے نمٹنا ہو گا۔ ہمیں یہ معاشرہ تبدیل کرنا ہو گا۔ ایک جدوجہد، طویل جدوجہد ـــــ جدوجہد مسلسل کرنی ہو گی ـــــ اس فرسودہ نظام کو ختم کرنا ہو گا۔ کیونکہ اس نظام کے خاتمہ میں ہی خواتین کی آزادی، مردوں اور عورتوں کے درمیان حقیقی مساوات کا راز مضمر ہے۔

بقیہ: چین منزل بہ منزل

عوام جس انداز میں اور جس پر چاہیں تنقید کر سکتے ہیں۔" اس انقلاب کی بدولت ردِ انقلاب نظریات اور ترمیم پسندانہ نظریات ختم ہو گئے۔ لیوشاؤچی اور دوسرے ترمیم پسند پارٹی لیڈر اور حکام برطرف کر دیئے گئے۔

- ۱۹۶۶ء میں ایک مرتبہ پھر اقوامِ متحدہ میں چین کی نمائندگی کے مطالبہ کو ۴۶ کے مقابلے میں ۵۷ ووٹوں سے مسترد کر دیا گیا۔
- ۱۹۶۷ء میں چین نے پہلے ہائیڈروجن بم کا دھماکہ کیا۔
- ۲۵ اپریل ۱۹۷۰ء کو چین نے اپنا پہلا خلائی سیارہ فضاء میں چھوڑا۔
- ۱۹۷۰ء میں چین نے اپنی سفارتی سرگرمیاں تیز کیں اور خارجہ پالیسی نئی بنیادوں پر استوار کی۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۰ء کو چیئرمین ماوزے تنگ نے امریکی رسالے "لائف" کے نمائندے مسٹر ایڈگر سنو کو انٹرویو دیا۔ جس میں چین کی خارجہ پالیسی پر عموماً اور امریکہ روس پر خصوصاً اظہارِ خیال کیا۔ چیئرمین ماوزے تنگ نے کہا "نکسن سیاح کی حیثیت سے آئیں یا صدر کی حیثیت سے، مجھے اُن سے بات چیت کر کے خوشی ہو گی۔"
- ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو اقوامِ متحدہ میں عوامی جمہوریہ چین کو اس کا جائز اور قانونی حق مل گیا۔ تائیوان کی رکنیت ختم کر دی گئی۔
- فروری ۱۹۷۲ء میں امریکی صدر رچرڈ نکسن نے چین کا دورہ کیا اور مشترکہ اعلامیہ میں انہوں نے تائیوان کو عوامی جمہوریہ چین کا تاریخی اور اٹوٹ حصہ تسلیم کیا۔
- ۲۵ اگست ۱۹۷۲ء کو عوامی جمہوریہ چین نے سلامتی کونسل کے اجلاس میں بنگلہ دیش کو اقوامِ متحدہ کا رکن بنانے سے متعلق قرارداد کو ویٹو کر دیا۔ سلامتی کونسل میں یہ چین کا پہلا ویٹو تھا۔







"سُرخ پرچم نہر" کے ہیرو

دس سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد سُرخ پرچم نہر مکمل ہوئی

احفاظ الرحمٰن

۲۰ اگست کو میں پیکنگ سے رخصت ہو رہا تھا۔ اس شہر سے جدا ہو رہا تھا جہاں میں نے اپنی زندگی کے سب سے دلکش دن گزارے ہیں۔ یہاں کی گلیاں اب تک میرے قدموں کی آہٹوں سے گونج رہی تھیں۔ یہاں کی ہواؤں میں اب تک میرے سانسوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ یوای پنکوان (فرینڈشپ گیسٹ ہاؤس) میں اب تک میرے قہقہوں کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ میں تھیان ان من اسکوائر میں کھڑا ہوا یوم اکتوبر کی پُرشکوہ تقریب دیکھ رہا ہوں۔ گریٹ ہال میں چواین لائی کی تقریر سُن رہا ہوں۔ سمر پیلس کی خوب صورت جھیل میں اپنے سوڈانی دوست محمد طحہٰ کے ساتھ کشتی چلا رہا ہوں۔ دیوار چین پر دم سادھے ماضی کے خونچکاں اوراق پر نظر دوڑا رہا ہوں۔ دفتر میں اپنے چینی ساتھیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہا ہوں۔ برفباری میں یوای پنکوان میں رہنے والے غیر ملکی بچوں کے ساتھ اسنو مین بنا رہا ہوں۔

تمام مناظر میری نظروں کے سامنے گھوم رہے تھے اور میں پیکنگ ریلوے اسٹیشن پر ہمیشہ کے لئے، اپنے تمام ساتھیوں سے، اپنی تمام یادوں سے رخصت ہو رہا تھا۔ ریل گاڑی دھیرے دھیرے اسٹیشن سے باہر نکل رہی تھی۔ دور پلیٹ فارم پر میری طرف لہراتے ہوئے آشنا ہاتھ آنسوؤں کی کُہر میں چھپتے جا رہے تھے۔ میرے کانوں میں "ہیرا موتی"، کا وہ گیت اب تک گونج رہا تھا جو میرے شعبے کے چینی ساتھیوں نے کل رات میرے فلیٹ پر گایا تھا۔

بھائی رے۔
موسم بیتا جائے۔
اپنی کہانی چھوڑ جا۔
کچھ تو نشانی چھوڑ جا۔
موسم بیتا جائے۔

موسم بیتا جا رہا تھا اور میں اپنی غیر دلچسپ کہانی چھوڑ کر پکنگ سے رخصت ہو رہا تھا۔

الوداع اے پکنگ کی بہار و، تاریک راہوں کے اس مسافر نے اپنے غریب وطن کے لئے تمہارے دامن سے کچھ پھول چنے تھے۔ اور اب وہ اس دن کا انتظار کر رہا ہے جب ان پھولوں کی خوشبو اس کے وطن میں ایک نئی بہار کا پیام لے کر آئے گی۔

الوداع !

ریل کے کیبن میں میں اپنے شعبے کے ساتھی شو تے انگ چے کے ساتھ اپنی ان خوش گوار یادوں کے ساتھ اپنی نئی منزل ـــــ لِنگ شِین کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جہاں کے کسانوں نے دس سال کی شدید جدوجہد کے بعد پہاڑوں کا سینہ چیر کر "سُرخ پرچم" نامی عظیم نہر تعمیر کی ہے۔

سہ پہر تین بجے ہم آن یانگ کاؤنٹی میں پہنچے۔ پلیٹ فارم پر آن یانگ اور لنگ شین کے بیرونی امور کے ذمے دار اکین وانگ دن سان اور چھنگ شوتی چن ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ویٹنگ روم میں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد روسی کار والگا میں لنگ شین کی طرف روانہ ہوئے۔ چھنگ شوتی چن ہمارے ساتھ تھے۔ لنگ شین، آن یانگ سے ۵۵ کلومیٹر دور ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے کا سفر تھا۔ میں رات کو ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سویا تھا۔ جسم پر بُری طرح تھکن سوار تھی۔ لیکن ذہن پر اشتیاق اور جستجو کا جذبہ غالب تھا۔ میری نگاہیں بڑی محویت کے ساتھ پیچھے بھاگتے ہوئے مناظر کا تعاقب کر رہی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف نیتے چین کے نئے کسان سر جھکائے مکئی اور کاؤلیانگ (جوار کی قسم کا ایک اناج) کے کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ کھجور کے ہیٹ پہنے ہوئے سائیکل سوار تیزی سے اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ کھاد سازی، سیمنٹ سازی اور اینٹوں کے بھٹوں کی چمنیاں گاڑھا، گاڑھا دھواں اگل رہی تھیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے الہ دین کا جن اپنے آقاؤں کے لئے کائنات کی وسعتوں کو اپنے دامن میں سمیٹ رہا ہو۔

ہماری کار لنگ شین کے خوبصورت گیسٹ ہاؤس میں داخل ہوئی۔ دروازے پر بیرونی امور کے نائب صدر کو شنگ تھاتے نے بڑی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ انہوں نے مجھے میرے کمرے میں پہنچایا۔ کچھ دیر رسمی سی باتیں ہوئیں۔ ہم نے پاکستان اور چین کے

چینی ساتھیوں نے ہیرا موتی کا گیت گایا۔ بھائی رے موسم بیتا جائے

پیمان دوستی کی تجدید کی۔ اس کے بعد کوشنگ تھائے نے لنگ شیئن کاؤنٹی اور "سُرخ پرچم نہر" کے متعلق چند بنیادی باتیں بتائیں۔

لنگ شیئن صُوبہ ہنان کے شمال مشرقی حصے میں واقع ہے۔ اس صُوبے کے شمال میں ہوپے اور مغرب میں شانسی کے صُوبے ہیں۔ لنگ شیئن کی آبادی ۰ لاکھ اور رقبہ دو ہزار مربع کلومیٹر ہے۔ اس وقت ۰ لاکھ ۹۰ ہزار مُوزمین زیر کاشت ہے جو کہ کل زمین کا ۱/۲ حصّہ ہے۔ یہاں پندرہ پیداواری کمیون ہیں جو ۷۰۴ پیداواری بریگیڈوں اور ۰۰ ۳۹ ٹیموں میں منقسم ہیں۔

کوشنگ تھائے کو یہ فکر لاحق تھی کہ ہم لوگ تھکے ہارے آئے ہیں۔ چار بج چکے تھے اور آج باہر نکلنے کا وقت نہیں تھا۔ انہوں نے دو تجویزیں پیش کیں۔ شام کو آپ نہر کے متعلق فلم دیکھ سکتے ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم لوگ بیٹھ کر تھان تھان (آزادانہ بات چیت) کریں گے۔ میں پیکنگ میں فلم دیکھ چکا تھا۔ اس لئے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ شام کو لنگ شیئن کے کامریڈوں کے ساتھ بیٹھ کر سُرخ پرچم نہر کے متعلق اور معلومات حاصل کروں گا۔ کوشنگ تھائے اور چھنگ شوتی آٹھ بجے آنے کا وعدہ کر کے رُخصت ہو گئے۔

آٹھ بجے وہ میرے کمرے میں آئے اور ایک بار پھر ہم نے "تھان تھان" کا سلسلہ شروع کر دیا۔

آزادی سے پہلے چین کے دوسرے علاقوں کی طرح لنگ شیئن کاؤنٹی بھی بہت پسماندہ تھی۔ لوگ سال بھر افلاس کا شکار رہتے تھے اور جنگلی سبزیوں اور درختوں کے پتوں پر گذارہ کرتے تھے۔ نوکر شاہی اور جاگیرداری کا غلبہ تھا۔ پانی کی قلت کی وجہ سے اناج کی شرح پیداوار ویسے ہی پست تھی، پھر تھوڑا بہت جو کچھ حاصل ہوتا، اس پر جاگیردار اور سرکاری حکّام قبضہ کر لیتے۔ کاؤنٹی میں ۵۰۰ دیہات ہیں جن میں سے ۳۰۰ دیہات میں پانی نایاب تھا۔ کسان دس میل کی مسافت طے کرنے کے بعد پانی حاصل کرتے تھے۔ اُس زمانے میں یہاں یہ کہاوت زبان زدِ خاص و عام تھی ـــــ "پانی تیل کی طرح ایک قیمتی چیز ہے!"

زمینداروں اور خوش حال کسانوں نے اپنے لیے کنویں کھدوا رکھے تھے۔ وہ کسی کو اپنا پانی استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ہر حاجت خواہ سے قیمت وصول کرتے تھے یا پھر پانی کے عوض غریب کسانوں کو بیگار کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ غسل کرنا بہت بڑی عیاشی تھی۔ کپڑے دھونے کے لیے پانی کیا مِلتا، وہاں تو پینے کے پانی کا حصول بھی مشکل تھا۔ فی مو سیر بھر سے زیادہ اناج نہیں ہوتا تھا۔ کھیت پانی کی بُوند بُوند کو ترستے تھے کسان حسرت سے آسمان کی طرف تکتے رہتے تھے بارش ہوتی تو ان کے کھیتوں کی پیاس مِٹ جاتی ورنہ ان کی بُجھی آنکھوں میں مسرتیں سِسکیاں لیتی رہتیں۔ ذہنوں میں اَن گنت سوالات ناچتے رہتے۔ آسمان کی رحمتوں کا سایہ صرف زمینداروں اور امیر کسانوں پر کیوں ہے؟ وہ صبح کب ہو گی جب زندگی ہم پر مہربان ہو گی، سوکھے ہونٹوں پر خوش رنگ بہاروں کے گیت مچل اٹھیں گے خوشی کے پھول کب مسکرائیں گے ـــــ؟

۱۹۴۴ء میں اس کاؤنٹی پر آزادی کا سورج طلوع ہوُا تو دھرتی اپنے جیالے بیٹوں کی راہ میں خوشیوں کے پھول بکھیرنے لگی۔ وہ کسان جو زرد پتّوں کی طرح مرجھائے ہوئے تھے، فولادی دیوار بن کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ کومنتانگ کی غلامی سے تو آزاد ہو گئے تھے لیکن خشک سالی کا مہیب دلیواب بھی ان کی جانب منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ ان کی صبح کے سامنے پیاسے کھیتوں اور سوکھے ہونٹوں پر تاریکیوں کا ڈیرا

تھا۔ انہیں آزادی مِل چکی تھی اور وہ اپنی آزادی کا تحفظ کرنے کے لیے سُرخ حکومت کو زیادہ سے زیادہ اناج فراہم کرنا چاہتے تھے تاکہ ان کا پسماندہ ملک تیزی سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے لیکن پانی تیل کی طرح قیمتی اور نایاب تھا۔ دھرتی کی پیاسی کوکھ سے اناج کیسے پیدا ہو جاتا۔

غریب کسانوں نے خود کو منظم کرنا شروع کیا۔ بکھرے ہوئے لوگ ایک مرکز پر جمع ہوئے تو سارے زاویے ان کی گرفت میں آ گئے۔ ایک نیا چین وجود میں آ رہا تھا۔ پرانا چین گھِسٹتا ہوا چین ماضی کے دھندلکوں میں چھپتا جا رہا تھا۔ دم توڑتے ہوئے چین میں نئی روح پھونکنے کے لیے قربانیوں کی ناقابل تسخیر جذبوں کی ضرورت تھی اور اب کسان اپنے نئے چین کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار تھے۔ اس نئے چین سے ان کی صدیوں پرانی آرزوئیں وابستہ تھیں۔ بکھرے ہوئے انسانوں کی صلاحیتیں یکجا ہوتی ہیں تو ایک انقلاب جنم لیتا ہے۔ لنگ شین میں کمیون کا تدریجی عمل شروع ہو گیا ابتدا میں امدادِ باہمی کی ٹیمیں بنائی گئیں اور پانی کی قلّت پر قابو پانے کے لیے ایک تدریجی منصوبے کے تحت کام شروع ہو گیا۔ جگہ جگہ کنوئیں اور چھوٹے چھوٹے نالے بنائے گئے۔ ۱۹۵۸ء میں تین خاصے بڑے آبی ذخیرے بنائے گئے۔ پھر ۲۷ "لی" لمبی" ہیرو نہر" تعمیر کی گئی جو آج تک موجود ہے۔ لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود پانی کا مسئلہ پوری طرح حل نہیں ہوا۔ بیشتر زمینیں اب تک سوکھی پڑی تھیں۔ چنانچہ ۱۹۵۸ء میں ایک بار پھر لنگ شین کے کسانوں کو خشک سالی کا سامنا کرنا پڑا۔ قدرت کے خلاف جدوجہد کی مہمیں، عمل کے دوران ہوتی ہے۔ اس عمل کے دوران خامیاں اور خوبیاں ابھر کر سامنے آتی ہیں اور جدوجہد کی نئی راہیں کھل جاتی ہیں۔ لنگ شین کے کسان ایک بار پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے کہا —— "ہمیں ایک نئے چین کی تعمیر کرنی ہے۔ پرانے معاشرہ میں ہم غلاموں جیسی زندگی بسر کرتے تھے۔ اب ہم سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ ہم اس ملک کے مالک ہیں۔ اس کی ترقی ہماری خوشحالی کی علامت ہے۔ ہمیں اپنے کھیتوں کو زیادہ سے زیادہ زرخیز بنانا چاہیئے اور حکومت کو زیادہ سے زیادہ اناج فراہم کرنا چاہیئے۔ کھیتوں کو زیادہ زرخیز بنانے کے لیے پانی بنیادی ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے" لنگ شین میں کوئی دریا نہیں تھا چنانچہ یہ فیصلہ کیا کہ پڑوسی صوبے شانسی کے دریا چانگ سے ایک لمبی نہر نکالی جائے جو کوہ تھائی ہانگ کا سینہ چیر کر پوری کاؤنٹی کو سیراب کرے دریائے چانگ لنگ شین کاؤنٹی کی سرحد سے چالیس لی دُور بہتا ہے۔ راستہ میں کوہ تھائی ہانگ کا طویل سلسلہ پھیلا ہُوا ہے۔ اس پہاڑ کو کاٹنا سب سے دشوار مرحلہ تھا لیکن



"سرخ پرچم نہر" کی بدولت پیداوار میں ۵ گنا اضافہ ہو گیا

نئے چین کی تعمیر کیلئے ناقابلِ تسخیر جذبوں کی ضرورت تھی

لنگ شین کے دلیر کسان صدر ماؤ کی ہدایت —— "سختیوں اور موت سے نہ ڈرو" کے تحت اس منصوبے کو مکمل کرنے کا بیڑا اٹھا چکے تھے۔ چنانچہ ۱۰ فروری ۱۹۵۹ء کو انہوں نے اس نہر کی کھدائی کے لیے اپنے ہاتھوں میں کدالیں اٹھا لیں اور پوری مستقل مزاجی کے ساتھ بلند پہاڑوں کو اپنے آگے جھکانے کی جدوجہد کرنے لگے۔ اس زمانے میں بین الاقوامی میدان میں چین کو چاروں طرف سے گھیرنے کی کوشش کی جا رہی تھی اور اندرونی طور پر بھی کسی حد تک انتشار پایا جاتا تھا۔ صوبہ ہنان میں لیو شاؤ چی کے ایجنٹوں کا زور تھا۔ انہوں نے سُرخ پرچم نہر کے منصوبے کو ایک ہوائی قلعہ سے تعبیر کیا۔ اور اس پر عمل در آمد بند کرنے کا حکم دے دیا۔ غریب کسانوں میں بے چینی پھیل گئی۔ ان کی صدیوں پرانی آرزو پر چند بدقماش افراد کے مذموم عزائم کا تاریک سایہ پھیلنے لگا۔ وہ اس نادر شاہی حکم کو کیسے تسلیم کر سکتے تھے۔ اس مسئلہ پر بحث چھڑ گئی۔ اور لنگ شین کے عوام دو گروہوں میں بٹ گئے۔ غریب کسان پوری سرگرمی سے اس منصوبے کی حمایت کر رہے تھے اور امیر کسان اور لیو شاؤ چی کے ایجنٹ اس کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔ جیت بالآخر غریب کسانوں کی ہوئی۔ ان کے پاس ضروری آلات، سرمائے اور مشینوں کی قلّت تھی۔ اس کے باوجود وہ دیوانوں کی طرح اپنے کام میں

آزادی کا سورج طلوع ہوا تو اداس راہوں میں خوشیوں کے پھول بکھر گئے



بٹے رہے۔ شروع شروع میں کسان اپنے دونوں ہاتھوں سے پہاڑ کو کاٹتے تھے بعد میں وہ خود انحصاری کے اصول کے تحت دیسی طریقے سے بارود بنانے لگے۔ عورتوں اور بوڑھوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ دس سال تک مسلسل کام ہوتا رہا اور آخر اگست ۱۹۶۹ء میں "سرخ پرچم نہر" مکمل ہوگئی۔ اس نہر کی کل پانچسو شاخیں ہیں جن کو ملا کر اس کی مجموعی لمبائی تین ہزار "لی" ہے۔ اس نہر پر بیس سے زیادہ پن بجلی گھر تعمیر کیے گئے۔ جن سے لنگ شین کے دیہات اور کارخانوں کو بجلی فراہم کی جاتی ہے۔ نہر پر لاتعداد بڑے اور چھوٹے نہری پل تعمیر کیے گئے ہیں۔ جن سے عوام کے لیے نقل و حمل کا نظام بھی بہت آسان ہوگیا ہے۔

"سرخ پرچم نہر" کی کہانی یہاں ختم نہیں ہوئی۔ جب آپ ان مشکلات کا ذکر سنیں گے جو لنگ شین کے کسانوں کو اس نہر کی تعمیر کے دوران پیش آئیں تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ ان غریب کسانوں نے کس طرح ایک ہزار سات سو میٹر بلند پہاڑ تھائی ہانگ کو اپنے قدموں میں جھکایا۔

"سرخ پرچم نہر" کی دس سالہ تاریخ کا ایک ایک لمحہ فطرت کے خلاف انسان کے ناقابلِ تسخیر جذبوں کی علامت بن کر ابھرا ہے۔ میں پیکنگ میں ہونگ چی چھوٹی "سرخ پرچم نہر" کی فلم دیکھ چکا ہوں۔ جب کسان کمر میں رسّہ باندھے بلند عمودی چٹانوں پر سے فضا میں معلّق جھولتے ہوئے آتے اور چٹانوں پر ہتھوڑے یا کدال کی ایک ضرب لگا کر پھر ہوا میں جھولتے ہوئے معلق ہو جاتے تو ہر تماشائی کا رواں رواں کھڑا ہو جاتا۔

جب بیرونی امور کے نائب صدر کو فنگ تھائے نے تفصیل کے ساتھ نہر کے مختلف مرحلوں پر پیش آنے والی مشکلات پر روشنی ڈالی تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے فلم میں جو کچھ دیکھا تھا وہ حرف بحرف درست تھا۔

لنگ شین کے کسانوں کے لیے پہاڑ کو کاٹنے، سرنگیں اور پل بنانے اور نہر تعمیر کرنے کا کام بالکل نیا تھا۔ ماضی میں انہیں اس کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ان میں کوئی انجینئر نہیں تھا——کوئی ڈیزائن ساز نہیں تھا لیکن چین کے محنت کش مشکلات سے مرعوب ہونا نہیں جانتے۔ میں خود اپنی آنکھوں سے ایسی ہزاروں مثالیں دیکھ چکا ہوں۔ چنانچہ لنگ شین کے کسانوں نے خود اپنے تجربے سے سیکھ کر ایک ایک تمام مسائل حل کر لیے۔

شروع میں قدرتی قوانین سے واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے کام کی رفتار بہت سست رہی۔ ۳۶ ہزار افراد اس کام پر لگائے گئے۔ پہاڑوں کی پگڈنڈیاں دشوار گزار تھیں۔ بہنگیوں اور ہاتھ گاڑیوں سے اوپر سامان پہنچانا جان جوکھوں کا کام تھا لیکن وہ مستقل مزاجی سے ڈٹے رہے۔ روزانہ —— پتھر اور مٹی ڈھونے کے لیے سینکڑوں ہاتھ گاڑیاں اور بہنگیاں استعمال کی جاتیں۔ پڑوسی صوبے شانسی میں دریائے جانگ کا وہ حصّہ جہاں سے وہ نہر نکال رہے تھے۔ لنگ شین کی سرحد سے چالیس "لی" دُور تھا۔ وہ روزانہ اتنی مسافت طے نہیں کر سکتے تھے اس لیے انہوں نے وہیں پہاڑوں اور غاروں میں مستقل رہائش گاہیں بنا لیں۔

کام کی رفتار سست تھی۔ کسانوں کے پاس محنت کرنے کا جذبہ تو تھا لیکن ان کا طریقۂ کار غلط تھا۔ یہ دیکھ کر طبقاتی دشمن اور وہ افراد جنہوں نے اس منصوبے کی مخالفت کی تھی۔ بہت خوش ہوئے۔ کسانوں کو بہت جلد اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ سست رفتاری پر قابو پانے کے لیے بہت بڑے پیمانے پر مباحثہ ہوا اور بالآخر یہ طے پایا کہ اس منصوبے کو چار مرحلوں میں تقسیم کر کے بیک وقت چار حصوں میں کام شروع کیا جائے۔ اس طرح ہر بریگیڈ اپنے اپنے علاقے میں نہر کی تعمیر میں حصّہ لینے لگا اور کام کی رفتار میں زبردست اضافہ ہوگیا۔

نہر کی تعمیر میں حصہ لینے والے کسانوں کی تکنیکی معلومات بھی ناکافی تھیں۔ چنانچہ انہیں قدم قدم پر ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا۔ خاص طور پر ڈیزائن سازی، پلوں کی تعمیر اور سرنگوں کی کھدائی کے دوران بار بار ان کے سامنے رکاوٹیں آ کھڑی ہوتیں۔ کسانوں کی خواہش تھی کہ باہر سے ماہر منگائے جائیں۔ دو ماہر آئے لیکن ان کی کارکردگی اچھی نہیں رہی۔ وہ لیو شاؤ چی کی راہِ عمل سے متاثر تھے اور ان میں کام کرنے کا سچا جذبہ موجود نہیں تھا۔ وہ کہتے تھے کہ پہاڑ کے اندر سے نہر نکالنا اور سرنگیں کھودنا بہت مشکل کام ہے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد یہ دونوں "ماہر" واپس چلے گئے کوئی نہیں تھا جو تکنیکی میدان میں ان کی رہنمائی کرتا۔

کسانوں نے ایک بار پھر میٹنگ بلائی اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ باہر سے کوئی مدد نہیں لیں گے۔ خود انحصاری کے اصول پر عمل کریں گے اور خود اپنے تجربے کی مدد سے مشکلات کا سامنا کریں گے۔ کاؤنٹی کمیٹی نے متفقہ طور پر ایک تکنیکی گروپ بنایا جس کا رہنما مڈل اسکول کا ایک طالب علم اوچو تھائے تھا۔ لنگ شین کا واحد ٹیکنیشن! یہ گروپ تکنیکی میدان میں واجبی سی شدبد رکھتا تھا۔ اپنی کمی دور کرنے کے لیے اس گروپ کے ارکان کسانوں کے اندر جا کر تحقیقات کرتے بڑی توجہ سے ان کے مشوروں اور تجویزوں کا تجزیہ کرتے اور اس کے بعد ڈیزائن سازی کا کام کرتے۔

عام طور پر بڑے پروجیکٹ کا ڈیزائن پہلے سے تیار کر لیا جاتا ہے لیکن لنگ شین کے کسانوں کے پاس کوئی ڈیزائن نہیں تھا۔ تین ہزار "لی" لمبی نہر کا پہلے سے کوئی ڈیزائن نہیں تھا! ایک طرف تو نہر کی تعمیر ہو رہی تھی۔ اور دوسری طرف ڈیزائن سازی کا کام ہو رہا تھا جب دوسرے علاقوں کے کارکنوں کو ہمارے اس پروجیکٹ کی اطلاع ملتی تو وہ ہم سے اس کا ڈیزائن مانگتے اور ہم جواب دیتے —— "ذرا انتظار کرو، ڈیزائن بن رہا ہے۔"

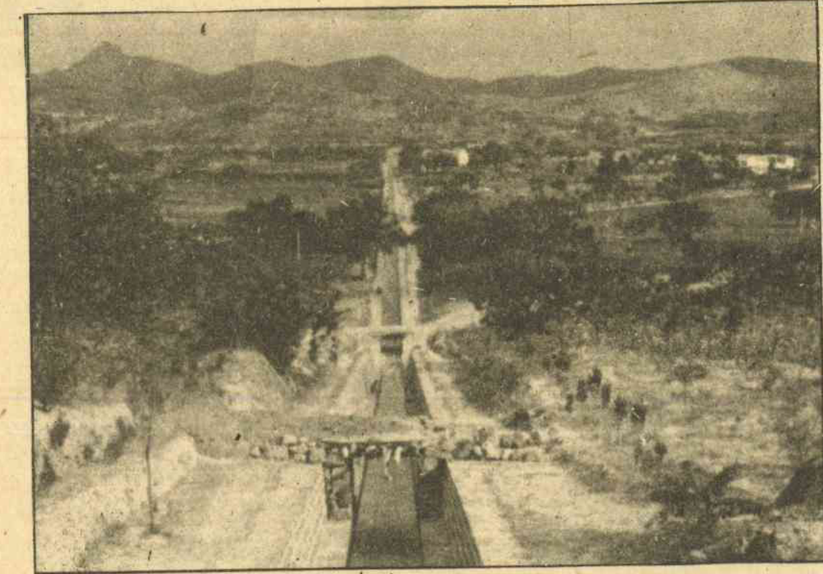
کسانوں کے پاس بارود کی قلت تھی۔ اس مسئلے پر قابو پانے کے لیے انہوں نے ایک انوکھا طریقہ استعمال کیا۔ حکومت کی دی ہوئی کیمیاوی کھاد سے بارود بنانے لگے (جنگِ مزاحمت کے دوران وہ گوریلا جنگ میں بارود بنانے کا تجربہ حاصل کر چکے تھے اس لیے انہیں کسی قسم کی مشکل پیش نہیں آئی) لیکن اس طرح کھیتوں میں کھاد کی مقدار کم ہو گئی۔ اس نئے مسئلے کو حل کرنے کے لیے وہ گھاس پھوس اور پتوں سے کھاد بنانے لگے۔



احفاظ الرحمان اپنے چینی دوستوں کے ہمراہ



جیالے کسان پہاڑ کا سینہ چیر کر "سرخ پرچم نہر" بنا رہے ہیں



"سرخ پرچم نہر" کا ایک منظر

تاریک راہوں کے مسافر نے تمہارے دامن سے کچھ پھول چنے تھے

انقلاب دشمنوں نے کسانوں کے جذبات کا مذاق اڑایا

نہر کی تعمیر کے دوران کام کرنے والے کسانوں کی جانوں کا تحفظ بھی ایک پیچیدہ مسئلہ تھا۔ اکثر و بیشتر حادثے پیش آتے۔ کھدائی کے وقت پتھر گرنے سے بہت سے افراد ہلاک اور زخمی ہوئے۔ طالب علم اوچو تھائے بھی اسی طرح کے ایک حادثہ میں شہید ہوئے۔ دس سال کے دوران کل بیس افراد ہلاک ہوئے۔ بیشتر ابتدائی دور میں؛ کیونکہ شروع میں کسانوں کے پاس تجربے کی کمی تھی۔ بعد میں تجربے سے مناسب تدابیر اختیار کی گئیں اور اس قسم کے حادثات کم ہو گئے۔ سرنگوں کی کھدائی کے دوران بہت سے حادثات پیش آئے تھے جہاں سخت چٹانیں تھیں، وہاں بارود سے بلاسٹنگ کرتے وقت اس بات کا امکان موجود رہتا تھا کہ جب بارود پھٹے گا تو پتھر اڑ کر کارکنوں پر گریں گے۔ چنانچہ انہیں فلیتے کو آگ دکھا کر جلدی سے باہر نکلنا پڑتا۔ جہاں زمین نرم ہوتی وہاں چھت نیچے گر پڑتی۔ کام کرنے والے نیچے دب جاتے یا اندر محصور ہو جاتے۔ بعد میں ایسی جگہوں پر لکڑی کے شہتیر لگا





کھیتوں میں نئے چین کے نئے کسان کام کر رہے تھے

دیئے جاتے تاکہ اس قسم کے حادثات کا امکان نہ رہے۔

ان تمام حادثات اور ان کے امکانات کے باوجود کسانوں کے عزم میں سرِ مُو فرق نہیں آیا۔ اگر کوئی شخص زخمی ہو جاتا تو اس کی کوشش یہ ہوتی کہ دوسروں کو اس کا علم نہ ہونے پائے۔ اگر کسی خاندان کا کوئی فرد ہلاک ہو جاتا تو اس کے دوسرے افراد اس کی جگہ لے لیتے۔

چانگ مائی چنگ کا باپ نہر کی تعمیر کے دوران ایک چٹان کی زد میں آکر ہلاک ہوا تھا۔ باپ کی تدفین کے وقت چانگ مائی چنگ کی ماں نے اس سے کہا —— "اب تمہیں باپ کی جگہ لینی ہے۔ تمہارے باپ نے اس کام کو ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ تمہیں اس کی تکمیل کرنی ہے۔ اس وقت تک دم نہ لینا جب تک کہ پانی ہمارے گاؤں میں نہ پہنچ جائے۔" اور چنگ مائی چنگ آج لنگ شیئن کے کسانوں کا ہیرو ہے۔

پُر خطر مقامات سے پتھر ہٹانے کے لیے ایک خصوصی ٹیم بنائی گئی تھی۔ اس ٹیم کا لیڈر ژن یانگ چھن تھا۔ وہ ایک دن کمر سے رسّہ باندھے ہوا میں معلق ہو کر بارودی فلیتے کے لیے چٹان میں سوراخ کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ان ساتھیوں سے جو اوپر بلندی پر اس کا رسّہ تھامے ہوئے تھے، کوئی بات کرنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ اوپر سے ایک پتھر اس کے منہ پر آ کر گرا۔ اس کی زبان دانتوں کے نیچے دب گئی اور چار دانت ہل کر ٹیڑھے ہو گئے۔ اس نے اپنے دستی اوزار سے خود ہی دانتوں کو سیدھا کرنے کی کوشش کی لیکن تین دانت جڑ سے اکھڑ گئے۔ اس بارودی فلیتے کو آگ دکھا کر اوپر والوں کو اشارہ کیا کہ وہ اسے اوپر کھینچ لیں۔ اوپر پہنچنے کے بعد اس نے کسی کو نہیں بتایا کہ وہ اپنے تین دانتوں سے محروم ہو چکا ہے۔ اگلے دن اس نے آرام تک نہیں کیا اور MOUTH COVER لگا کر پھر کام پر آ گیا۔ کھانے کے وقت جب اس نے کھانا نہیں کھایا تو باورچیوں کو بڑی تشویش ہوئی۔ اور پھر یہ بھید کھلا کہ ژن یانگ چھن کے دانت گر گئے ہیں۔ نہر کا مر پڑوں نے اسے آرام کرنے کا مشورہ دیا لیکن وہ برابر کام پر جاتا رہا۔ آزادی سے قبل ژن یانگ چھن کا گھرانہ بہت مفلوک الحال تھا۔ جب وہ پیدا ہوا تھا تو اس کی ماں کے پستانوں میں دودھ نہیں تھا اس کا باپ اسے بکری کا دودھ پلاتا تھا۔ اسی وجہ سے اسے ژن یانگ چھن (بکری کے دودھ پر پلا ہوا) کا نام دیا گیا۔ ماضی کے یہ کچلے ہوئے لوگ ہی نئے چین کی سب سے بڑی قوت ہیں۔

"سرخ پرچم نہر" کے منصوبے کی خبر عام ہوئی تو ملک بھر کے مزدوروں، کسانوں، سپاہیوں اور طالب علموں نے لنگ شیئن کے کسانوں کو خیرسگالی کے پیغامات اور خطوط روانہ کیے۔ انہیں روزانہ ان گنت پیکٹ موصول ہوتے جن میں مختلف قسم کے تحائف موجود ہوتے۔ اور ارسال کنندگان کے ناموں کی جگہ صرف "ایک طالب"، "ایک کسان"، یا "ایک مزدور" لکھا ہوتا۔

دس سال کے دوران نہر کی تعمیر میں ایک کروڑ ۴۰ لاکھ کیوبک پتھر اور مٹی استعمال ہوئی۔ شاخوں کو ملا کر اس کی مجموعی لمبائی تین ہزار "لی" ہے۔ آزادی سے قبل یہاں فی مو صرف سو جن اناج حاصل ہوتا تھا۔ نہر کی تکمیل کے بعد اب اوسطاً پانچ سو جن اناج حاصل ہوتا ہے۔ نہر کی تکمیل سے پہلے تک حکومت سے ہر سال دو کروڑ جن اناج خریدا جاتا تھا لیکن اب لنگ شیئن والے ہر سال حکومت کو پانچ کروڑ جن فروخت کرتے ہیں۔ مختلف جگہوں پر پن بجلی گھر قائم کیے گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے دیہات میں بجلی عام ہو گئی ہے۔ بجلی کی وجہ سے صنعت کو فروغ حاصل ہوا ہے اور وہاں لوہا سازی، کھاد سازی، سیمنٹ سازی اور مشین سازی کے متعدد کارخانے قائم ہو گئے ہیں۔ کارخانوں کی وجہ سے زراعت کو بھی فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ نہر کی تکمیل کے بعد مجموعی طور پر پیداوار میں تیس فیصد اضافہ ہو چکا ہے۔

اب لنگ شیئن کے عوام کو پانی حاصل کرنے کے لیے میلوں لمبا فاصلہ طے نہیں کرنا پڑتا۔ نہروں میں ہر جگہ بچے نہاتے نظر آتے ہیں۔ عورتیں کپڑے دھوتی ہیں، سرسبز کھیت لہلہا رہے ہیں۔ بوڑھے لوگ جو ماضی کی تلخ زندگی کے مصائب سے پوری طرح آشنا ہیں، بار بار کہتے ہیں کہ "اس دور میں نئے نظام کے تحت ناممکن کو بھی ممکن بنایا جا سکتا ہے، یہ دور ہمارا دور ہے۔"

نائب صدر کو شنگ تھائے کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی ہیں۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ہم مسلسل تین گھنٹے سے گفتگو کر رہے تھے۔ میرے ذہن میں بہت سے سوالات موجود تھے لیکن میں نے انہیں زیادہ دیر روکنا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے وہاں مزید تین دن قیام کرنا تھا اور کل صبح سے میں وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے والا تھا جس کی وجہ سے پورے چین میں اس کاؤنٹی کے جیالے کسانوں کے گیت گائے جاتے ہیں۔

"سائے جین" (الوداع) کو شنگ تھائے، چھنگ شوئی چھن اور میرے مترجم شوئے انگ پے مجھ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔ مجھ پر دن بھر کی تھکن سوار تھی اور میں ان کے جاتے ہی سونے کی تیاری کرنے لگا۔

عظمتِ ایشیا — چین

احمد ریاض

سحر سے پہلے

ماؤ کا دیس، زرّیں نگارِ وطن
چیانگ کے دور تک مر کے جیتا رہا
اپنے سینے پہ ہر وار سہتا رہا
خوں اُگلتا رہا، زہر پیتا رہا
ہر قدم چوٹ پر چوٹ کھاتا رہا
گھاؤ بھرتا رہا زخم سیتا رہا

دُشمنوں کے لیے، رہزنوں کے لیے
اپنے بچوں کو ایندھن بناتا رہا
پاک رُوحوں کا تاوان دیتا رہا
شوخ جسموں کے تحفے سجاتا رہا
اپنے شہروں کو قربان کرتا رہا
اپنی دھرتی کے موتی لٹاتا رہا

سالہا سال تک ماؤ کے دیس میں
سامراجی خداؤں کا چرچا رہا
محنتوں کو ترازو میں تولا گیا
کاروبارِ ہوس کار فرما رہا
لُوٹ مچتی رہی بھوک بڑھتی رہی
ذوقِ غارت گری تیغ آرا رہا

پرتگیزوں نے سوداگری کے عوض
یانگسی کے کناروں کو ویران کیا
نانکن کے تقدّس کو داغا کبھی
بزمِ پیکنگ کو بے ساز و سامان کیا
علم و تہذیب و تعمیر کے نام پر
ظُلم کو آدمیّت کا عنوان کیا!

فتنہ کارانِ ہسپانیہ نے کبھی
اپنی فرعونیت کو اُچھالا یہاں
شاطرانہ سیاست کی سنگین پر
زندگی کو لہو میں اُچھالا یہاں
اپنے خالی خزانوں کو بھرتے رہے
بستی بستی کو روندا کھنگالا یہاں

غاصبانِ ولندیز کے قافلے
اس گلستان میں خیمے سجاتے رہے
ہر حسین کنج سے پھول چنتے رہے
اپنی سیجوں کو رنگیں بناتے رہے
پتی پتی کو مسموم کرتے رہے
غنچے غنچے کو افیوں پلاتے رہے

ارضِ نیپولین کے جواری کبھی
ہر نئے داؤ پر فتح پاتے رہے
خوں بہاتے رہے خون پیتے رہے
قریہ قریہ کو مقتل بناتے رہے
اپنی عظمت کے بدلے یہاں رات دن
دوسروں کی وجاہت گنواتے رہے

راک فیلر کی دھرتی کے بانکے کبھی
رسمِ سوداگری آزماتے رہے
توپ کی چھاؤں میں تیغ کے سائے میں
امن کے نام پر دندناتے رہے
ڈالروں کے چھناکے سناتے رہے
کاروبارِ غلامی سکھاتے رہے

آمرانِ فرنگ اپنا پرچم لیے
اپنی ہیبت کا سکہ بٹھاتے رہے
اپنی طاقت کے بل پر مچلتے رہے
اپنی حکمت کے کرتب دکھاتے رہے
"حفظِ آزادئ دیگراں" کے لیے
قہر بن بن کے فتنے جگاتے رہے

۷۔فروری ۱۹۲۳ء کا قتلِ عام

دورِ مغرب کے قزّاق جادوگروں کی فسوں کاریاں رنگ لاتی رہیں
پے بہ پے نو بہ نو ظلم ہوتا رہا خون بہتا رہا جسم گلتے رہے
بستی بستی میں بڑھتی رہی تیرگی، گاؤں گاؤں میں ڈھلتی رہی مفلسی
چیانگ کے دَور تک شہروں شہروں میں انسانیت کے شکاری مچلتے رہے

اپنی خونخواریوں، قہر سامانیوں کو حیاتِ ابد بخشنے کے لیے
چین کے تاجداروں شہنشاہوں کو رمزِ ملّت فروشی سکھاتے رہے
منفعت بخشیوں کے دلاسے پہ جاگیرداروں کی بھرتے رہے جھولیاں
زر پسندوں کے ذوقِ وطن دشمنی کو بڑھاتے رہے آزماتے رہے

حق پسندانِ کنٹون کے خون سے رنگ آزادئ قصر و ایواں ہوئی
سرفروشانِ ہانکاؤ کے قاتلوں کی شجاعت کے ڈنکے بجاتے رہے
سر پھرِ ہانگ ہو کی خنک تاب موجوں سے رفتار کا زعم چھین گیا
چانگ تسن کے شہیدوں کی لاشوں کے پرچم فضا میں سجائے اڑائے گئے

ہانگ چاؤ کی بربادیوں کے فسانوں کو تعمیر کا نام دیتے رہے
فتنہ خو، ظلم بردار پی فو کی غدّاریوں کے قصیدے سُنائے گئے
شام منچوریا کی شہابی دُھنک خاک ہوتی رہی دُھول بنتی رہی
صبح منگولیا کی سپیدی پہ ظلماتِ شبگوں کے پہرے بٹھائے گئے

حسنِ تنسین کی سرمئی آب سے خلوتوں، جلوتوں کو نکھارا گیا
ارضِ شنگھائی کے موتیوں کی دمک سے محلّاتِ شاہی فروزاں ہوئے
خوبرویانِ شنسی کی غیرت سے ہر بوالہوس کھیلتا، داد پاتا رہا
گل بدوشانِ سویان کے رُوپ سے حجلہ ہائے ستم شعلہ ساماں ہوئے

انجمستانِ ہونان کی نازنینوں کو جنسِ تجارت بنایا گیا
کانگ ٹن کی حسیناؤں کے پاک جسموں کا گلیوں میں نیلام ہوتا رہا
بزمِ تنگ شان کی مہ جبینوں کا ہر ایک انگ مسلا گیا نوچ ڈالا گیا
وادئ ہاؤپائی کے گل دامنوں کا جواں حُسن بدنام ہوتا رہا

ماؤ کا دیس زریں نگار وطن چیانگ کے دورتک مر کے جیتا رہا
اپنے سینے پہ ہر وار سہتا رہا، خوں اُگلتا رہا زہر پیتا رہا

افیونی جنگیں

۱۸۴۰ء اور ۱۸۵۷ء میں برطانوی اور ہسپانوی متھیار بند فوجوں نے چین پر حملہ کیا۔ ان جنگوں کو افیونی جنگوں کا نام دیا گیا ہے۔ ان جنگوں کا پس منظر یہ ہے کہ برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے چین سے تجارتی دشواریوں کے پیش نظر چوری چھپے افیون کا کاروبار شروع کر دیا کیونکہ بنگال میں افیون کی اجارہ داری اس کے پاس تھی اس لیے کمپنی بہت ہی سستے داموں افیون چین میں برآمد کرتی رہی۔ اس صورت حال کے پیش نظر چین کی مرکزی حکومت کو بہت پریشانی ہوئی جس کے باعث چینی حکومت نے افیون

کے چوری چھپے چین آنے پر سختی سے پابندی لگادی۔ اس صورت حال نے برطانوی تجارت کو تباہ کردیا۔ نتیجے کے طور پر ۱۸۴۰ء
میں برطانوی فوجوں نے چین پر حملہ کردیا۔ اس کے بعد ۱۸۵۷ء میں اسی قسم کا ایک اور حملہ کیا گیا

پورب دیس کے سوداگر افیون کا تحفہ لائے
اس تحفے کو جو اپنائے سُکھ کا جیون پائے

تم انمول نگر کے باسی پریم کے ہم ہرکارے — تم چینی تم رشیوں مہاراجوں کے راج دلارے
ہم اپنائے کے بیری نیائے کے پالنہارے — ہم نیائے کی دولت لے کر آئے دوار تمہارے

اس دولت اس نذرانے کو جو کوئی ٹھکرائے
اس کی نگری اس دھرتی کی آگ میں جھلسی جائے

ماؤ دیس کی جنتا نے اس تحفے کو ٹھکرایا — پورب کے دھنوانوں نے اپنا نیائے دکھلایا
دھن دھن دھن دھن توپوں نے اگنی گولے برسائے — بربادی نے گھونگٹ کھولا موت نے پر پھیلائے
چین کی دھرتی پر پورب والوں نے پاؤں جمائے — طاقت کے بل پر آشا کے جلتے دیپ بجھائے

مہاراجوں، مکھیوں نے بھی جنتا کا مان گنوایا
سارے دیس کا سودا کر کے اپنا آپ بچایا

چاروں کھونٹ اندھیرا چھایا بیری راس رچائیں — دیس کے رسیا کس کو دردی مانیں دکھ بتلائیں
دیس میں پردیسی پہرے داروں نے جھنڈے گاڑے — اپنا تحفہ دے کر چین کے بستے شہر اجاڑے
اس کالی اس موت کی دیوی نے گھر گھر للکارا — رجواڑوں کے بھاگ جگائے نردھنتوں کو مارا

پورب دیس کے سوداگر انمول نگر کے پیارے
پریم کی جوت جگانے والے نیائے کے یہ ہرکارے

چین کی دھرتی پر افیون کے کارن آن بر اجے
موت کے رتھ پہ جگ جیون جگ پالن آن براجے

۳۰۔ مئی کی تحریک

اس تحریک کا پس منظر یہ ہے کہ ۳۰ مئی ۱۹۳۵ء کو شنگھائی میں برطانوی اور جاپانی کارخانہ داروں کے خلاف مزدوروں کی ہڑتال کے بعد ملک میں ایک زبردست انقلابی طوفان آگیا۔ برطانوی پولیس نے مزدوروں اور طالب علموں پر گولیاں برسائیں۔ بے شمار مظاہرین ہلاک اور زخمی ہوئے۔ لیکن مزدوروں کی جدوجہد تیز تر ہوتی گئی اور یہ ہڑتال ۱۶ مہینے تک جاری رہی۔ اس طرح اس تحریک نے چین کے عوامی انقلاب کی بنیاد رکھ دی۔

وہ دن کہ جس دن دیارِ مغرب کے فتنہ آشام تاجروں نے
غریب محنت کشوں کے خوں سے بساط جاہ و حشم سجائی
حسین کینٹین کی شاہراہوں پہ جشن مرگ و جنوں منایا
عظیم شنگھائی کی زمینوں پہ بزم جور و ستم سجائی

وہ دن کہ جس دن فرنگ زار جہاں کے شاطر مداریوں نے
ذہین و فن کار نوجوانوں کی زندگی کا جمال چھینا،
شعور و دانش کی بے کراں وسعتوں میں تاریکیاں بکھیریں
حریمِ فکر و نظر کی پُر کیف چاندنی کا جمال چھینا،

وہ دن کہ جس دن غرور اسکندری سے معمور خود سروں نے
حیات کا نام لینے والوں کے جذبۂ کامراں کو روکا
ثبات کی راہ میں بچھائیں سُلگتے بارود کی سُرنگیں
شعور و جہد طلب کے بڑھتے ہوئے امڈ کارواں کو روکا

وہ دن کہ جس دن بنامِ امن وسلامتی سامراجیوں نے
حیات کی چاہ کرنے والوں کو موت کا راستہ دکھایا
وہ دن کہ آزادئ وطن کا پیام جس دن گناہ ٹھہرا
وہ دن کہ جس دن خزاں نے غنچوں کا روپ لوٹا، بھرم گنوایا

وہ دن کہ جس دن وطن میں "غیروں" نے چیانگ سے دوستی نباہی
جوان ومغرور کامگاروں کے خون سے راستے سجائے
قدم قدم پر ہنروروں کے مذاقِ فن کا مذاق اڑایا
حقوق کا نام لینے والوں کو اپنی توپوں کے گُن دکھائے

بجا کہ اس دن چیانگ کے ساتھیوں نے ذلّت کی داد پائی
بجا کہ اُس دن فرنگ زادوں نے اپنی فطرت کا گیت گایا
بجا کہ اُس دن اداس ماؤ کے منچلوں نے شکست کھائی
بجا کہ اس دن وطن فروشوں نے حریت کا علم گرایا

مگر یہ تاریخ جس کا ہر لفظ دے رہا ہے یہی گواہی
کہ سارے جگ کو وہ دن وہی دن پیامِ نو بھی سنا رہا تھا
پیامِ نو جس میں اِک حسین انقلاب کروٹ بدل رہا تھا
پیامِ نو جس میں اِک نیا چین سب کے نزدیک آ رہا تھا

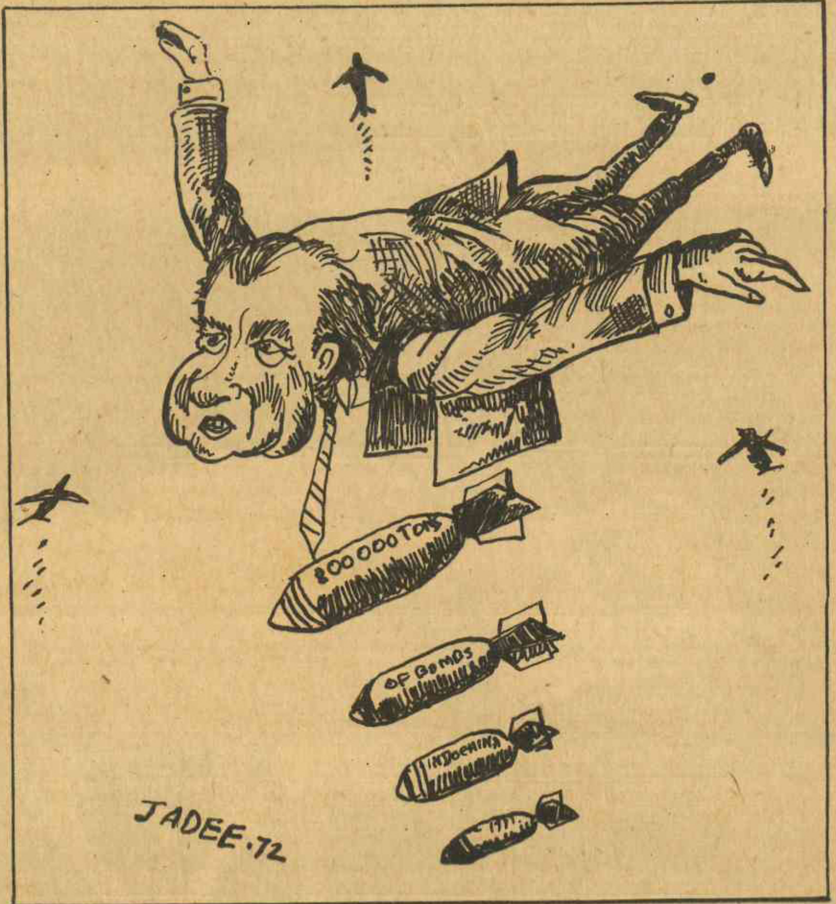
وہ دن وہی دن تھا اجنبی جابروں کو عبرت کا تازیانہ
وہ دن وہی دن ستم شعاروں کی رہ میں دیوار بن کے اُٹھا
وہ دن وہی دن جوان ماؤ کو دے رہا تھا نئی قیادت
وہ دن وہی دن غرورِ شاہی کے سر پہ تلوار بن کے اُٹھا

جو خون اس دن بہا وہ حسنِ حیاتِ جاوید ہو کے نکھرا
جو جسم اُس دن کٹے وہی افتخارِ صد کائنات ٹھہرے
جو اشک اس دن گرے وہی مہر وماہ بن کر فلک پہ چمکے
جو خواب اس دن لٹے وہی انتہائے عزم وثبات ٹھہرے

(نامکمل)

تین ماہ میں دریائی پشتوں پر ۷۶۴ بم گرائے گئے

ناصر حبیب



سمیت مختلف ملکوں کے سائنس دانوں، سیاسی لیڈروں اور سفارتی نمائندوں کے علاوہ امریکہ ہند چینی میں امریکی بموں کی بارش میں کام کرنے والے اخباری نمائندوں نے پینٹاگون کی ایک نئی غیر انسانی حرکت پر جو وہ ویت نام میں کر رہا ہے۔ خبردار کیا ہے۔ طغیانی کے زمانوں میں نشیبی علاقوں کو سمندری اور دریائی سیلاب سے بچانے کے لئے تعمیر کئے ہوئے پشتوں پر امریکہ نے بمباری شروع کر دی ہے۔

ویت نام کے شاندار اور بے نظیر پشتے خوف ناک سیلابوں کو روکے رکھتے ہیں اور دریا کے ساتھ ساتھ بل کھاتے ہوئے سینکڑوں میل تک چلے گئے ہیں۔ یہ پشتے صدیوں بلکہ ہزاروں سال میں بنے ہیں۔ بعض دریا جو پہاڑوں سے ریت، مٹی اور بجری اور کنکر اپنے ساتھ بہا لاتے ہیں انسانوں سے نبرد آزما معلوم ہوتے ہیں ان کی تہہ اونچی ہوتی رہتی ہے اور لوگ اپنے کھیتوں اور دیہاتوں کو بچانے کے لئے صدی در صدی ان پشتوں کو اونچا کرتے رہے ہیں۔

آپ نے اس بچے کی کہانی تو سنی ہوگی جس نے پشتے میں سے پانی رستے دیکھ کر اپنا ہاتھ پانی کے سوراخ میں دیدیا اور ٹھنڈ سے نیل پڑنے کے باوجود ساری رات گاؤں والوں کا انتظار کرتا رہا تاکہ اس مصیبت کو روکا جا سکے۔ آپ کو قطعی توقع نہیں ہوگی کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو جان بوجھ کر ان پشتوں کو تباہ کر دیں گے۔

کارنی وال یونیورسٹی کے ایک محقق رپورٹر نے ایک امریکی ہفت روزہ "نیو ری پبلک" میں لکھا ہے کہ ۱۹۴۴ء میں ہالینڈ میں ہٹلر کے کمشنر زیتیس انکارٹ نے پیچھے ہٹنے والی جرمن فوجوں کو یہاں کے پشتے اڑانے کا حکم دیا تھا۔ جس سے ایک عام اندازے کے مطابق کوئی پانچ لاکھ ایکڑ زمین سیلاب سے متاثر ہوئی تھی۔

اس وقت کسے معلوم تھا کہ یہ جرم ایک نظیر کے طور پر فوجی فائلوں میں درج کیا جائے گا۔ چنانچہ ۱۹۶۷ء میں جب صدر جانسن کی شمالی ویت نام پر تباہ کن بمباری ناکام ہوئی تو جوائنٹ چیف آف اسٹاف نے شمالی ویت نام میں پشتوں کو تباہ کرنے کے امکانات کا جائزہ لینا شروع کیا اور پینٹاگون نے اس نازی ہتھکنڈے کو آزمانے کے لئے سی۔آئی۔اے کی رائے طلب کی اور سی۔آئی۔اے نے جواب میں اپنی رائے یوں دی کہ دریائے سرخ کو کناروں سے بہہ نکلنے سے روکنے والے پشتوں پر بروقت بمباری کرنے سے فصلوں کی پیداوار کافی کم ہو جائے گی۔ لیکن ساتھ ہی سی آئی اے نے اپنے اس خدشے کا بھی اظہار کیا کہ اس قسم کی بمباری سے دنیا میں شدید ردِ عمل کا اظہار کیا جائے گا۔ اس لئے "یہ بمباری مختصر مدت کے لئے محدود پیمانے پر کی جائے۔"

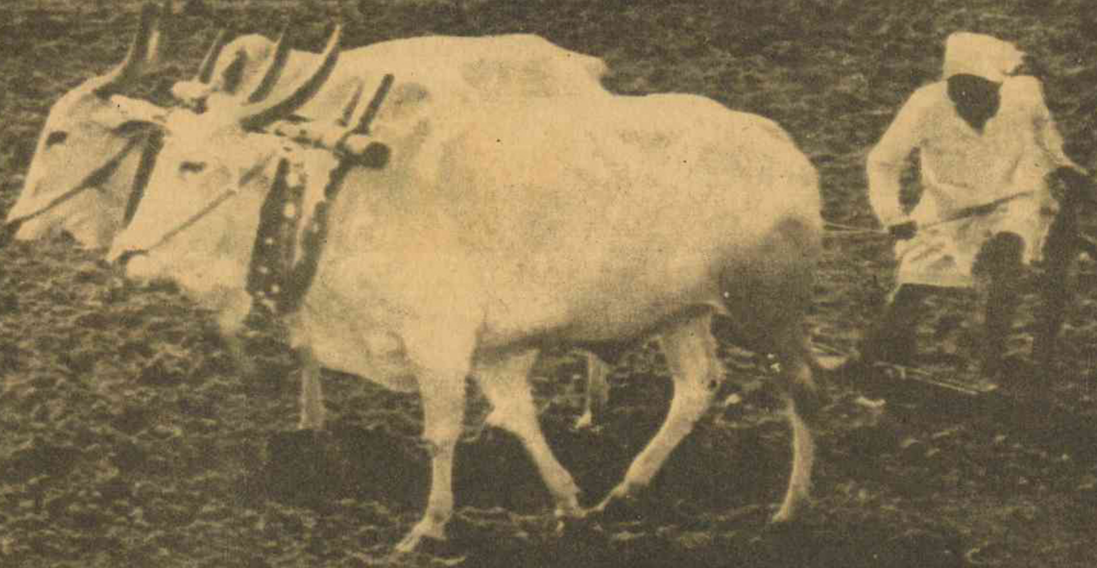
۱۶ جون ۱۹۶۷ء کو وزیر دفاع میکنامارا نے اس تجویز کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ عالمی رائے عامہ اور خود امریکی رائے عامہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو حد سے بڑھنے کی اجازت نہیں دیگی۔ لیکن امریکی جنرل اپنی ریشہ دوانیوں سے باز نہیں آئے اور انہوں نے "تجرباتی بنیادوں پر" پشتوں پر بمباری شروع کرا دی۔ امریکی اخباروں کے مطابق شمالی ویت نام پر امریکہ کے ہوائی حملے دوبارہ شروع ہونے سے کافی عرصہ پہلے ان پشتوں کی تصویریں اتار لی گئی تھیں۔

اب حال ہی میں شمالی ویت نام کی پانی کی ذخیرہ کاری کی وزارت کی ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ ۱۰ اپریل سے ۲۹ جون تک امریکی ہوائی جہازوں نے شمالی ویت نام کے ۳۷ پشتوں اور ۳۳ آبی تعمیرات پر ۷۰ حملے کئے اور بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ۷۶۴ بم گرائے۔ صرف جون میں امریکی ہوائی جہازوں نے شمالی ویت نام کے آبی پشتوں اور تعمیرات پر بیس حملے کئے جن پر اس سے قبل اپریل اور مئی میں بھی متعدد بار حملے کئے جا چکے تھے۔

دنیا بھر کے اخبارات نے امریکہ کی اس وحشیانہ بمباری کی تفصیلات شائع کی ہیں۔ ان حملوں کا مشاہدہ کرنے والے نامہ نگاروں اور سفارتی نمائندوں نے بتایا ہے کہ پہلے تو امریکی ہواباز ان پشتوں اور بندوں کو اڑانے کے لئے بمباری کرتے ہیں تاکہ اس طرح زیریں علاقوں میں سیلاب آ جائے۔ اس کے بعد جب مقامی لوگ ان پشتوں کی مرمت کرنے پہنچ جاتے ہیں تو ان لوگوں پر بھی وحشیانہ بمباری کی جاتی ہے۔

باقی صفحہ ۵۸ پر ملاحظہ فرمائیں

منتخب افسانے





لاٹی پوجا

علی عباس حسینی

۲۸ ستمبر - ۵ اکتوبر ۱۹۷۲ء — ۴۰

الفتح

ہریا، لاٹھی پر ٹیک لگائے آم کے باغ میں کھڑی تھی۔ چار بج چکے تھے مگر اب تک لو چل رہی تھی۔ دھوپ ہریا کے کندنی رنگ کو تپا کر گلابی بنا رہی تھی۔ جسم میں شعلے سے لپٹتے محسوس ہوتے۔ کھیتوں میں سے سیاہی مائل لہر سی اٹھتی اور باغ کی طرف دوڑتی دکھائی دیتی۔ ہوا کے ان جھونکوں سے باغ کی جھاڑیاں اور سوکھی لمبی گھاس میں پھنسے ہوئے الجھے ہوئے خشک پتے کھڑکھڑاتے اور درختوں کے ہرے پتے پھڑپھڑاتے تھے۔ شریر ہوا ہریا کے آنچل کو جھولے کے پینگ دیتی اور ساری کے نچلے حصّہ کو غبارہ بناتی تھی۔ مگر ہریا یہ بات سے بے خبر لاٹھی پر ٹھڈی رکھے فضا پر نظر جمائے کھڑی تھی۔

باغ والی گڑھیا میں اس کی بھینسیں پڑی تھیں۔ گڑھیا میں پانی نام ہی کو تھا۔ مئی کے مہینے میں یو۔ پی کے سارے تال تالاب سوکھ جاتے ہیں۔ یہ گڑھیا ذرا گہری تھی اس لئے اس کے بیچ میں کیچڑ نما پانی گھٹنوں گھٹنوں اونچا اب بھی باقی تھا۔ اسی میں ہریا کی چاروں بھینسیں لیٹی بیٹھی اپنے کو ٹھنڈا کر رہی تھیں۔ گائیں ذرا زیادہ نازک مزاج اور صفائی پسند ہوتی ہیں انہیں کیچڑ میں لت پت ہونا نہیں بھاتا۔ ہریا کی گائیں بھی کچھ دیر تو بھینسوں کو کچھ رشک، کچھ حقارت سے دیکھتی رہیں۔ پھر باغ میں جا کر سوکھی گھاس نوچنے لگیں یا درختوں کی آڑ میں بیٹھ کر جگالی کرنے لگیں۔

باغ تھا قلمی آموں کا۔ اب کے فصل اچھی آئی تھی۔ گاؤں کا کھٹک اسے پہلے ہی خرید چکا تھا۔ وہ اپنی چھوٹی سی منڈیا میں بیٹھا ہریا اور مویشیوں کی حرکتوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اسے ڈر تھا۔ آم سے لدی ہوئی شاخیں کہیں ہریا کو ہاتھ لپکانے پر مائل نہ کر دیں۔ یا کوئی گائے گردن بڑھا کر پتیاں کھانے اور پھل گرانے پر تیار نہ ہو جائے۔ لیکن آنکھیں اپنے پھلوں کی نگہبانی کرنے کے علاوہ کچھ اور بھی دیکھ رہی تھیں وہ تھیں ہوا سے بار بار کھلتی ہوئی گوری گوری پنڈلیاں اور آنچل کے پردے سے نکل کر لہرانے والی کالی کالی ناگنیں! ہریا کھٹک کے وجود سے بے خبر لاٹھی پر ٹھڈی رکھے کھڑی تھی۔ داہنا ہاتھ تو لاٹھی کو سیدھا رکھنے میں لگا تھا۔ بائیں ہاتھ سے کبھی وہ آنچل برابر کر لیتی کبھی سر کے اڑتے ہوئے بالوں کو اور کبھی ساری کے پھولتے ہوئے نچلے حصے کو بچا دیتی تھی۔ اس کے جسم میں ایک لہر سی دوڑتی، وہ پھول کی ٹہنی کی طرح ہلتی جھکتی اور سنبھلتی تھی۔ اور اس کی انگلیاں بھاؤ بتانے والے انداز سے کھلتی مڑتی اور سمٹتی تھیں۔ مگر یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ بے جانے بوجھے۔ ہریا اپنے خیالات میں غرق بس کھڑی سوچ رہی تھی ہائے! کتنی بدل گئی اس کی دنیا! بیوہ ہوتے ہی! لچھن کی زندگی میں کبھی اسے اپنے مویشی چرانے کے لئے خود نہ نکلنا پڑا تھا۔ بیسیوں آدمی خوش خوش ایسے فرائض مفت انجام دیدیا کرتے تھے۔ لچھن اپنی لاٹھی کے لئے دور دور مشہور تھا۔ ضلع میں کوئی بڑی فوجداری ایسی نہیں ہوتی تھی جس میں لچھن شریک نہ ہوا ہو۔ وہ دو مرتبہ اس سلسلہ میں پکے گھر بھی ہو آیا تھا۔ بڑے بڑے ٹھاکر اس سے دبتے تھے اور اس سے مدد مانگتے تھے۔ وہ جس کی طرف ہو جاتا اس کی جیت یقینی تھی۔ کھیتوں پر قبضہ کرنے، ان میں پانی چڑھانے اور درختوں کو کٹوانے میں ہمیشہ گاؤں میں دو پارٹیاں ہو جاتی تھیں۔ جن کو لچھن کی پشت پناہی حاصل ہوتی۔ وہ ساری زبردستیاں کر لیتا۔ کوئی اس سے نہ بولتا۔

ہریا نے اس طاقت و رعب کا مزہ چار برس اٹھایا تھا۔ خود اپنے گھر میں بھی کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ دس بیگھے کھیت جوت میں تھے۔ بلواہی۔ پرواہی۔ نکاہی۔ کٹاہی۔ سارے کام مفت میں انجام پا جاتے۔ گیہوں۔ ارہر۔ چنا۔ مٹر۔ ریکھ سب ہی کچھ اس کے کھیتوں میں ہوتا۔ اور اتنا ہوتا کہ بیچا جاتا۔ زمینداری کے زمانے میں اتنی کسی کی ہمت نہ تھی کہ اس سے کوئی لگان وصول کر لیتا۔ اب جب سے وہ ان کھیتوں کا "بھومیدھر" بن گیا تھا۔ سرکاری لگان تو دینا ہی پڑتا تھا۔ پھر بھی وہ تھا ہی کتنا؟ پیداوار کے مقابلے میں بہت ہی کم۔ غلہ کی آمدنی کے علاوہ اس کے پاس دس گائیں اور چار بھینسیں تھیں۔ ان کا دودھ، دہی، گھی بیچ کر دو ڈھائی سو ماہوار آجاتے کھانے والے اور خرچ کرنے والے صرف میاں، بیوی۔ دو نفر! اس پر ترکاری مفت آتی تھی اپنے اور آس پاس کے گاؤں والے کوری ہر فصل کی چیز نذر دے جانا فرض سمجھتے تھے۔ ان کو ڈر تھا اگر "بھوگ" چڑھانے میں ذرا بھی دیر ہوتی تو پورا کھیت چرا دیا جائے یا اکھاڑ دیا جائے گا۔

یہی وجہ تھی کہ سہاگ کے چار برس میں ہریا سونے میں پیلی بن گئی۔ وہ تو موتیوں میں سفید بھی بن جاتی مگر دیہاتن تھی وہ بھی اَن پڑھ اور موتیوں کی قدر جوہری ہی جانتا ہے یا بادشاہ۔

بہرحال ان دنوں ہریا خوش تھی مگن تھی۔ ہر وقت گنگناتی رہتی تھی۔ بس اسے فکر تھی تو دو باتوں کی۔ ایک تو یہ کہ اب تک اس کی گود بھری نہ تھی۔ اس کے لئے وہ کبھی کبھی یاترا کی سوچتی تھی۔ مگر لچھن ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتا۔ کاہے کی جلدی ہے۔ یہ بھی ہو رہے گا۔ ہاں ہریا البتہ سورج نکلتے وقت آسمان کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھرتی اور اس کے ہونٹ کانپنے لگتے۔ گویا وہ میاں کی آنکھ بچا کر بھگوان سے کہتی ہوتی کہ مجھے میرا چاند بھی دے۔

دوسرا سوچ جو ہریا کو گھن کی طرح کھائے جا رہا تھا وہ یہ تھا کہ لچھن کسی طرح پرائے پھٹے میں پاؤں ڈالنے کی عادت چھوڑ دے۔ وہ چاہتی تھی۔ وہ ہو اور اس کا شوہر، میٹھی میٹھی باتیں ہوں اور پریم کی چھیڑ چھاڑ، وہاں حالت یہ تھی کہ لچھن دن دن بھر اور اکثر پوری پوری راتیں اپنی جتھہ بندی میں پھنسا رہتا۔ ضلع بھر کا خدائی فوجدار بنا پھرتا۔ زیادہ دن نہیں ہوئے ابھی چھ مہینے ادھر کی بات ہے کہ گشائیں پور کے مشہور ٹھیت چھیدا کے خلاف لچھن نے دھاوا بول دیا تھا۔ چھیدا اپنے گاؤں کے ایک کوری کے کھیت پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ روتا دھوتا فریاد لئے پہنچا لچھن کے پاس پھر کیا تھا۔ ہریا نے لاکھ روکا اور سمجھایا دوسرے گاؤں کی بات ہے۔ تم کاہے کو بیچ میں پڑتے ہو۔ مگر لچھن کو تو زور آزمائی کا موقع مل گیا تھا۔ وہ پانچ چار چیلوں کو لے کر گشائیں پور پہنچ گیا۔ لاٹھی چلی اور خوب چلی، مگر کھیت پر ہل چلا کوری ہی کا چھیدا زخمی ہو کر ہسپتال داخل ہو گیا۔ اس فتح نے لچھن کی سرداری پر گویا مہر لگا دی۔ اس کی لاٹھی کی "دھاک" سارے ضلع پر بیٹھ گئی۔ اس خوشی میں طے ہوا۔ "لاٹھی پوجا کی جائے"۔

"وہ بھی کیا رات تھی، اماوس کی رات، چاندنی چٹکی ہوئی۔ خاصی ٹھنڈک مگر ایک ہزار "ٹھیت" لاٹھی پوجا میں شرکت کے لئے اکٹھا ہوئے تھے گھر کے سامنے والے میدان میں بیسیوں کڑھائے چڑھے ہوئے تھے۔ حلوائی پوریاں چھان رہے تھے۔ حلوہ مٹھائی بنا رہے تھے۔ جتنا جس کا جی چاہے کھائے جتنی سمائی ہو پیٹ میں بھرے۔ کسی چیز کی کمی نہ ہو۔

وہ جن کے گلوں کنٹھے تھے اور دوسروں کے ہاتھ کا پکا یا نہ کھاتے تھے۔ انہوں نے اپنے الگ چولھے بنا رکھے تھے۔ کوئی ہنڈیا چڑھائے کھچڑی ابال رہا تھا۔ کوئی اپلوں کے بھوبھل میں "بھوری" لگا رہا تھا۔

جب رات کا کھانا تیار ہو گیا تو پروہت جی بلائے گئے ایک بڑے سے گڑ بنانے والے کڑھائے کے گرد زمین لیپی گئی اس پر آکر وہ بیٹھ کر انہوں نے کچھ اشلوک اور منتر پڑھے

پھر دس من دودھ میں لچھن کی لاٹھی کو نہلایا۔ کڑھائے میں اکٹھا کیا ہوا دودھ "پرشاد" کی طرح ہر ایک کو کلھڑوں میں بانٹا گیا۔ پھر کھانے میں ہاتھ لگا۔ منچلوں نے ایک دوسرے کو للکار للکار کر ڈھائی ڈھائی سیر کی پوریاں کھا ڈالیں اور چار چار سیر پانچ پانچ سیر دودھ پی ڈالا۔ پھر رات بھر برہے کا مقابلہ رہا۔

کتنا خوش تھا لچھن اس رات۔ سپید ادھی کا کرتہ جسم میں۔ گلابی رنگی ہوئی دھوتی ٹانگوں میں۔ اشرفیوں کی مالا گلے میں موٹا سا پھولوں کا گجرا سینے پر رجدھر جاتا تھا۔ ہر ایک گورو گورو سردار سردار کہہ کر ہاتھوں ہاتھ لیتا۔ اور برہا گانے والا کوئی نہ کوئی ٹکڑا اس کی تعریف میں ضرور بڑھا دیتا۔

ہریا دودھ، دہی، شکر، آٹا، گھی، ترکاری، نمک مسالہ بانٹتے بانٹتے تھک گئی تھی۔ چور ہو گئی تھی۔ مگر اسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ آج بیٹے کی بارات لے جانے کے پہلے کھانا دے رہی ہے۔ جیسے بھی ہو سارے کھانے والے خوش رہیں۔ ہر شخص کو اس کی پسند کی چیز مل جائے اور ہر ایک ڈٹ کر کھائے اس لیے اس تھکن میں بڑا انند تھا۔ عجیب طرح کی خوشی اور مستی۔!

چاندنی رات میں جگہ جگہ چولھوں کی روشنی ایسی نظر آتی جیسے سفید جارجٹ کے دوپٹے پر زری کے پھول بنا دیئے گئے ہیں۔ رات جب بھیگ گئی، چھوٹے چولھے گل ہو گئے اور ہلکا کہر سارے میں چھا گیا تو بڑے بڑے الاؤ جلا دیئے گئے۔ ان کے لمبے بھڑکتے شعلے ایسے لگتے جیسے دھوئیں کی چادر کے پیچھے انار چھوٹ رہے ہیں۔ گویا گھر میں برات اُتری ہے اور آتش بازی بھی ساتھ لائی ہے۔

کئی دن اس خوشی کا خمار رہا۔ ہریا کا جوڑ جوڑ دکھتا تھا مگر تعریف کرنے والوں اور مبارکباد دینے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ خود لچھن بھی اس اطمینان سے سویا کہ ہریا کو ہر صبح کو گدگدا کر اٹھانا اور ناشتہ کرنے کے لیے جگانا پڑا! اور وہ انگڑائیاں لے کر اس طرح بیوی کو دیکھتا جیسے ہریا سچ مچ سپنوں کی پری بن گئی تھی۔ مسرت کی لہر اسی طرح اٹھتی رہی اور ابھی تہ میں بیٹھنے نہ پائی تھی کہ اچانک لاٹھی پوجا کے ساتویں دن لچھن مار دیا گیا

کتنا تکلیف دہ تھا وہ دن بھی۔ چار بجے صبح کو جبکہ خاصا اندھیرا تھا۔ کسی نے کنڈی کھٹ کھٹائی۔ لچھن باہر گیا۔ دونوں میں آہستہ آہستہ باتیں ہوئیں اور لچھن جھپٹتا ہوا اندر آیا اور لاٹھی اٹھا کر نکل گیا۔ ہریا لچھن کے اس طرح چلے جانے کی عادی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی آئے دن ایسا ہوا کرتا تھا۔ مگر آج ہریا کا دل نہ جانے کیوں آپ ہی آپ گھبرانے لگا۔ وہ پلنگ پر لیٹی نہ رہ سکی وہ اٹھ بیٹھی اور اس نے باہر جا کر مویشیوں کو ناند پر لگا دیا۔ پھر لوٹا لے کر جنگل چلی گئی۔ پلٹ کر وہ اپنے پکے کنوئیں سے گگرے پر گگرا بھر کر خوب نہائی اور ساری بدل کر دودھ دوہنے لگی۔ مگر یہ عجیب بات ہوئی کہ جب بالٹی دودھ سے بھر چلی تو دودھ کی مٹیا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین کی طرف چلی اور اس کے سنبھالنے میں جو ہریا جھپٹی تو دودھ سے بھری بالٹی ٹھوکر کھا کر الٹ گئی اور دس سیر دودھ زمین پر بہہ گیا۔

اس بدشگونی پر ہریا کو یقین آ گیا کہ آج کا دن خیریت سے گزرنا مشکل ہے۔ وہ بھد سے زمین پر بیٹھ گئی اور عجیب طرح کی بے بسی محسوس کر کے رونے لگی۔

اب پو پھٹ چکی تھی۔ کوّے قائیں قائیں کر کے درختوں سے گھروں کی طرف جا رہے تھے۔ چڑیاں چہک رہی تھیں۔ دُور کسی اور کا بچھڑا ماں کے لیے بائیں! بائیں! کر رہا تھا۔ اہیر ٹولی میں چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ مویشی کھولے باندھے جا رہے تھے اور دودھ دوہا جا رہا تھا۔ اہیرنیں کھتریوں میں دودھ اور جھوؤں میں سوکھے اُپلے گاؤں میں لے جا کر بیچنے کے لیے رکھ رہی تھیں۔ مگر ہریا سر پکڑے زمین ہی پر بیٹھی رہی۔ اس میں سے ایک اہیرن نے اپنے گھر سے اسے اس حالت میں دیکھا لپکی ہوئی آئی۔ اس نے پوچھا "اِے توں کاہے چپ چاپ بیٹھیں ہو؟" دفعتاً اس کی نظر گرے ہوئے دودھ پر پڑی۔ وہ چیخ پڑی ارے دیا رے اری کا بھوا، اب اتھا دن کا دودھ کیسے دی ہو؟"

جب ہریا کچھ نہ بولی تو وہ خود ہی ہر ایک کے ہاں سے جا کر تھوڑا تھوڑا سا دودھ مانگ لائی اور ہریا کو ساتھ لے کر گاؤں میں جہاں جہاں دودھ مقرر تھا سب گاہکوں کو پہنچا آئی۔ ہریا بہت کم خود دودھ لے کر کہیں جاتی تھی یہ کام بھی لچھن کے خوف یا خاطر سے دوسرے ہی کر دیا کرتے تھے مگر آج صبح ہی سے کوئی نہ آیا اسے خود ہی جانا پڑا۔ پھر گھر پلٹی تو بڑی تنہائی محسوس ہوئی۔ چرواہا مویشیوں کو میدان میں لے جا چکا تھا۔ گھر میں کوئی نہ تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے لیے دو روٹیاں ٹھوکیں اور انہیں مل کر دودھ میں ڈال کر کھا لیا مگر پاؤ بھر یہ دودھ بھی ایسا دوبھر ہو گیا کہ آدھا جھوٹا باہر جا کر ڈال آئی۔

وہ بار بار گھر سے نکل اِدھر اُدھر دیکھتی پھر مایوس ہو کر گھر کے اندر چلی جاتی۔ وہاں اپنے کو پلنگ پر گرا دیتی، کروٹیں بدلتی، اُٹھ کر پانی پیتی پھر جلتی ہوئی دھوپ میں دوڑتی ہوئی باہر آتی، دیر تک اِدھر ادھر دیکھتی رہتی پھر مایوس واپس جاتی۔ دو بجے تک وہ یہی آہی جاہی لگی رہی۔ پھر وہ باہر والے چھپّر ہی میں جم کر بیٹھ گئی۔ اسے ٹھنڈک لگتی نہ گرمی، اسے پیاس تھی نہ بھوک، پھر بھی ہونٹ پپڑائے ہوئے تھے حلق سوکھا ہوا تھا اور زبان میں کانٹے پڑے تھے۔

شام کے قریب چرواہا دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے یہ خبر سنائی: "لچھن کو دشمنوں نے دھوکے سے مار ڈالا اور اس کی لاش کو گنڈاسے سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے دریا میں مختلف جگہوں پر اس طرح ڈال دیا کہ کوئی پتہ نہیں چل سکتا"

ہریا کو عمر میں پہلی اور آخری بار غش آیا۔ وہ دس دن بخار اور سرسام میں پڑی رہی۔ جب وہ اپنے حواس میں آئی تو دو ایک دن تک لوگوں نے اس سے یہ دُکھ بھری کہانی چھپائی۔ پھر آہستہ آہستہ بتایا کہ گاؤں کے چوکیدار کی رپٹ پر سپاہی بھی آئے تھے اور خود دار دغہ بھی۔ بڑی پوچھ گچھ رہی۔ کشائیں پوز تک دوڑ گئیں - دریا میں جال بھی پڑے مگر لچھن کے جسم کا کوئی ٹکڑا نہ ملا اور قانون کی رُو سے جب تک لاش نہ ملے کسی کو قاتل نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ ہر شخص کو یقین تھا کہ یہ کام چھیدا کا ہے مگر کوئی ثبوت نہیں ملتا تھا۔ غرض پولیس معمولی کوشش کر کے بیٹھ رہی۔ نہ اسے لچھن کے مارے جانے کا غم اور نہ اُس کے قاتل کے سراغ لگانے کی کوئی خاص فکر تھی۔ اس کے نزدیک تو خس کم جہاں پاک والا معاملہ تھا۔

مگر ہریا کا تو راج لُٹ گیا۔ دودھ بکنا بند ہو گیا۔ ترکاریوں کا آنا بند ہو گیا۔ ہر کام میں ہاتھ بٹانے والوں کا تانتا بند ہو گیا۔ نہ اب اس کے پاس کوئی چرواہا تھا نہ ہرواہا۔ نہ چیلوں کا جتھہ نہ خوشامدیوں کا گروہ۔ وہ لوگ جو اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ڈرتے تھے اب اسے دیکھ کر آنکھ مارتے تھے۔ جن کی اس کے سامنے گھگھی بندھتی تھی وہ اب فقرے کستے تھے۔ جس لاٹھی نے اس کے گرد لوہے کی دیوار کھینچ رکھی تھی وہ ٹوٹ گئی تھی۔ اب تو ہر ایک اس کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا۔ وہ ایک ٹوٹی ہوئی شاخ کا پکا پھل تھی۔ ہر ایک اسے توڑ کر کھا لینے کا

اپنے کو حقدار سمجھتا تھا۔

ہریا اِن بدلی ہوئی نظروں کو پہچانتی تھی۔ وہ دل ہی دل میں کُڑھتی مگر کر ہی کیا سکتی تھی۔ کوئی اپنا نہ تھا جس سے ان بیگانوں کی شکایت کرتی۔ گاؤں میں کوئی بھی ہمدردی کرنے اور سر پر ہاتھ رکھنے کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔ سب کو لچھن سے کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی آزار ضرور پہنچا تھا جس کے ساتھ اُس نے احسان کیے تھے وہ بھی انہیں بھول گئے تھے بلکہ الٹے گڑے مُردے اکھاڑے گئے اور سر کے زخم کرید کرید کر پھر سے ہرے کر لیے گئے۔ ہریا ایک پاجی، بدمعاش ڈاکو کی بیوی تھی۔ اسے بے سہارے بے جان گرا ہوا دیکھ کر ہر ایک اسے دو تین لاتیں مار دینا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ بیماری ہی میں گھر کا بہت سا اثاثہ صاف کر دیا گیا تھا۔ اب رات ہی رات اس کا تیار کھیت کاٹ لیا گیا۔ اس کے مویشی ہر بہانے مویشی خانے پہنچا دیئے گئے۔ حد یہ ہوگئی کہ اس کے سب سے اچھے بیلوں کی وہ جوڑی جو سال بھر پہلے لچھن نے آٹھ سو کی خریدی تھی ایک رات کھونٹے سے کھل کر غائب ہوگئی اور کچھ پتہ نہ چلا کہ زمین میں سما گئی یا آسمان پر اُڑ گئی

یہی وجہ تھی کہ ہریا اب خود مویشی چراتی تھی اور رات میں انھی کے قریب کھٹیا ڈال کے سوتی تھی۔ یہی باتیں تھیں جو وہ اس وقت لُو میں کھڑی سوچ رہی تھی اور بار بار دل میں اِن تمام تکلیفوں کا باعث چھیدا کو ٹھہراتی اور اس سے نفرت کی آگ کو ہوا دے دے کر بڑھاتی تھی۔ اور اس کا بس چلتا تو وہ چھیدا کی بوٹی بوٹی دانتوں سے نوچتی اور چیل کوؤں کو کھلاتی۔

وہ یہی سوچ رہی تھی کہ کھٹک نے زور زور سے الاپنا شروع کیا۔۔

اسی باعیس تو کتنے آسکاں سے منا کرتے تھے ~ اکیلی پھر رہی ہو یو سپھے بے کارواں ہو کر

(اسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے ~ اکیلے پھر رہے ہو، یوسف بے کارواں ہو کر)

ہریا شعر کے معنی تو نہ سمجھ سکی مگر اس میں چھپے ہوئے طعن کو سمجھ کر تلملا اُٹھی۔ وہ لاٹھی اٹھا کر جھپٹتی ہوئی منڈیا تک آئی اور لاٹھی تان کر بولی۔ "کھٹک کا جنا! لچھن مر گئیل اہکا لاٹھی نہ مرل!" کھٹک ڈر کر جھونپڑی کے کونے میں دُبک گیا۔ وہیں سے کانپتی آواز میں بولا۔ "اُرے ہم کچھ کہت ہیں بہو جی!"

وہ بولی۔ "ہاں، تو ہم ہوں کہہ دیت ہیکن کہ ہم کا ایسن ویسن مہریا مت جنی ہو! ہم سر توڑ کے رکھ دیب!" اتنے میں ایک گائے جو ہریا کو کان اٹھائے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کیا سمجھی کہ یکایک بھڑک کر بھاگی۔ ہریا نے دُور تک اس کا پیچھا کیا اور اسے ہنکا کر گلے تک لائی۔ پھر بھینس گڑھیا سے نکال کر سارے مویشیوں کو بڑبڑاتی ہوئی ہنکاتی ہوئی گھر لے گئی۔ اتفاق سے اسی وقت کشائیں پور کا ایک آدمی دکھائی دیا۔ ہریا نے اسے روک کر کہا :۔

"چھیدا سے کہہ دیو کہ چھُپ چھپ کر وار کرنا مردن کا کام ناہیں اور نہ بدھوا کو ستانہ بہادری بائے اہکا لڑے کا جی چاہت ہے تو، یہاں پنچن کے سامنے آکر ہم سے لاٹھی چلائے۔"

چھیدا اسی رات کو آیا اور تنہا آیا۔ ہریا اپنے چھپّر میں غافل سو رہی تھی۔ اس نے پلنگ سے دور کھڑے ہو کر کنکریاں پھینک کر اسے جگایا۔ وہ گھبرا اٹھی۔ چھیدا وہیں سے بولا۔ "ذرا لالٹین جلاؤ بہو جی تو ہم تُہہ سے بات کریں۔"

ہریا نے لالٹین جلا کر دیکھا تو ایک سانولے رنگ کا میانہ قد نوجوان ہے۔ سر پر پگڑی، ننگے بدن، دھوتی "کاچھے" کی طرح کسی ہوئی، ہاتھ میں ایک سیاہ تیل لگی ہوئی لاٹھی، چہرے پر شرارت آمیز مسکراہٹ اور چمکتی ہوئی آنکھیں۔ ہریا نے پوچھا:۔

"کون ہو جی تم؟"

اس نے کہا "چھیدا۔"

نام سنتے ہی ہریا کے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ وہ چھلانگ مار کر پلنگ سے پھاندی اور اس نے ایک موٹی سی گالی دے کر چھیدا پر وار کیا۔ چھیدا اچھل کر اپنے کو بچا گیا اور ہنس کر بولا :۔

"واہ رے بہو جی واہ! پا ہن اہو طرح کیس اتارل جات ہے"۔

ہریا نے پھر لاٹھی تانی۔ وہ ہاتھ اٹھا کر روک کر بولا :۔ "ارے جری بات تو سُن لے! ہم کا تُہہ سے لڑے کا ہوت تو کا ہم تُہہ کا ٹھار ہوئے دیئت؟"

ہریا ہانپتی ہوئی بولی :۔ "تو جلدی کہہ۔ کا کہے کے ہے؟"

چھیدا بولا۔ "بہو جی، ہم پر جھوٹ الجام ہے۔ ہم لچھن کا نا مرلیں، اوہی کا گٹ والا ال کے گھات کئی لیس اوہے۔ تو رکھیت کاٹن ہن تو ر گر د بچھو چراوت ہن۔"

ہریا کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ چھیدا کے لب و لہجہ میں اتنی سچائی تھی، اتنی نڈر تھی۔ اتنا بھروسہ تھا کہ ہریا اس کی بے گناہی پر یقین کیئے بغیر نہ رہ سکی۔ مدتوں سے جو نفرت کا قلعہ کھڑا تھا۔ وہ چھیدا کی باتوں ہی سے ڈھ پڑا۔ اس نے اپنی ٹانگوں میں کمزوری محسوس کی اور وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔ وہ سوچنے لگی چھیدا کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی سب نے لچھن کا قاتل کہہ کر اس کا کیا بگاڑ لیا تھا۔ کہ اگر اس وقت اقرار کر لیتا تو ہریا اس کا کچھ کر لیتی۔ پھر اگر واقعی ہریا کو ستانا چاہتا تو وہ سوتی ہوئی عورت کو ہر طرح پریشان کر سکتا تھا اس پر لاٹھیاں برسا کر مار ڈالتا۔ اس کا گلا گھونٹ دیتا۔ اس کے مویشی کھول لے جاتا۔ اس کے وار کو خالی دینے کی جگہ لاٹھی کا جواب لاٹھی سے دیتا۔!

چھیدا نے کہا: "ارے بھوجی! بدماسن کی سرداری بڑا جان جوکھم کا کام ہے جہاں مجبوت بھیل اوہے سردار بنے کا چاہت ہن اپنے گاؤں کا نرپت دیکھو، آج کل کیسن سانڑ بنا بھرت ہن"

ہریا نے "تو اوہے مرلیس"۔

چھیدا نے کہا۔ "ای ہم کا جانیں۔ کل ہم نا مرلیس"

ہریا نے بڑی بے بسی سے کہا :۔ "تو ہم کا کریں؟"

وہ بولا۔ تم تنکو چنتا ہن کرو۔ آنند سے بیٹھو۔ ہم سب انتظام کر دئیب !" اور وہ چلا گیا۔

دوسرے ہی دن گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ آس پاس کے گاؤں میں چھیدا کے آدمی گھوم گھوم کر کہہ گئے ہیں کہ ہریا کے کھیت یا مویشیوں کو اگر کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو اُسے سمجھنا پڑے گا۔ ہریا کو یہ خبر سُن کر ذرا سکون تو ہوا مگر اسے سب سے زیادہ فکر تھی اب کہ کھیتوں کے جوتنے کی۔ بیل چوری جا چکے تھے۔ ہل کیسے چلے گا۔ کیا اب کے سب کھیت ایسے ہی پڑے رہیں گے۔ یہ نہیں تھا کہ ہریا کے پاس نئے بیل خریدنے کے لیے دام نہ تھے۔ وہ اچھی سے اچھی جوڑی خرید سکتی تھی مگر وہ گھر اکیلا چھوڑ کر کہیں میلے ٹھیلے میں جا بھی تو نہیں سکتی تھی۔ دن دہاڑے لوگ گھر میں گھس کر جمع جتھا نکال لے جاتے۔ کوئی مرد ایسا نہ تھا جس کو کئی سو روپے بیلوں کے خریدنے کے لیے دے دیئے جائیں۔ بیوہ کے روپے مار لینا کون سی بڑی بات ہے۔ ہریا کو اس زمانے میں یہ بڑی شدت سے محسوس ہوا کہ بغیر اپنے مرد کے ایک تنہا عورت کے لیے زندگی بڑی دشوار ہے۔ اسی لیے اسے بار بار چھیدا کا خیال آتا۔ سوچتی اسی کے ہاں کہلا دوں، وہی انتظام کر دے گا مگر عورت زاد تھی کہلاتے شرما بھی گئی تھی۔ نہ جانے دل میں کیا سمجھے۔ اور بات پہنچانے والا کیا کیا معنے پہنا دے۔

وہ اسی حیص بیص میں تھی کہ جُون کی پندرہ آ گئی۔ مانسون چلا۔ ابر آسمان پر چھا گئے۔ بادل مینڈھوں کی طرح آپس میں ٹکرائے۔ پانی ٹوٹ ٹوٹ کر برسا اور سارے میں جھل تھل ہو گیا۔ جن کے پاس دھنگر تھے، انہوں نے تو مینڈھیں اونچی اونچی کر کے اپنے کھیتوں میں پانی روکا۔ جن کے کھیت ذرا بلندی پر تھے اور دوسرے اناج بونا چاہتے تھے۔ انہوں نے مینڈھیں کاٹ کاٹ کر پانی نکال دیا۔ ہریا گھر ہی بیٹھی رہی۔ اپنے کھیتوں کے قریب نہ گئی۔

چوتھے دن جب پانی رکا اور دھوپ نکلی تو ہر طرف چہل پہل تھی۔ کھیتوں پر ہل چل گئے۔ مہینوں کے کھیت شاداب و سیراب ہو کر مسکرا رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا۔ کھیت نہیں ماؤں کی چھاتیاں ہیں کہ اپنے بچّوں کے لیے ...... دودھ سے بھری پڑی ہیں۔ ان کی بھوک پیاس بجھانے کے لیے ان کو شکم سیر کرنے کے لیے ان کو غذا اور طاقت دینے کے لیے ہریا بھی اندر نہ بیٹھ سکی۔ وہ کئی بار اپنے کھیتوں کی حالت جا کر دیکھ آئی، وہ گود پھیلائے اسے بلا رہے تھے۔ آؤ، آؤ، ہمیں کھودو، کاٹو، روندو، ہمارا سینہ پھاڑو، ہم تمہیں خوشی خوشی اجازت دیتے ہیں۔ مگر ہریا آنکھوں میں آنسو بھر کر منہ پھیر لیتی اور لمبے لمبے قدم رکھ کر گھر بھاگ آتی اور اپنی تنہائی اور بے بسی محسوس کر کے لہک لہک کر روتی تھی۔ شام کو جب ہر کسان خوش خوش پلٹا تو ہریا نے مویشیوں کو چارے پر بھی نہ لگایا۔ وہ اندر گھس گئی۔ اس نے کنڈی بند کر لی اور وہ منہ لپیٹ کر کھاٹ پر گر پڑی۔ دماغی کوفت اور تھکن نے اسے خوب غافل کر دیا وہ سوئی اور گھوڑے بیچ کر سوئی۔ دن چڑھے وہ اس وقت اٹھی جب کسی نے کنڈی کھٹ کھٹا کر اسے زور زور سے پُکارا۔

وہ باہر آئی تو اس نے دیکھا ایک اجنبی کھڑا ہے۔ اس نے تیکھے پن سے پوچھا:۔ "توں کون ہو اور کا چاہت ہے ؟"

اس نے کہا۔ اپن کھیت پر چلو۔ چھیدا بلاوت ہن !"

وہ بکی ہوئی ساتھ ہو لی۔ تھوڑی ہی دور پر وہ کھیت تھے جن میں گیہوں بویا جاتا تھا۔ دیکھا تو ان میں تین ہل ایک ساتھ چل رہے ہیں اور یہ ہیں سب گوشائیں پور کے۔ خیال آیا۔ یہ میرے کھیتوں پر قبضہ کرنے کی ترکیب تو نہیں لیکن قبل اس کے کہ وہ کچھ کہہ سکے کندھے پر ہاتھ رکھے اور ناگوری بیلوں کی جوڑی ہنکاتا ہوا سامنے سے چھیدا آتا ہوا دکھائی دیا۔

وہ ہریا کے قریب آ کر بولا: بھوجی، جا کے دیکھ لیو تہار سب کھیت جت گئل !" اور ہریا ادھر مڑ گئی جدھر دوسرے کھیت تھے۔ سب جتے ہوئے ملے۔ پھولوں کی طرح ہنستے ہوئے ہر ایک کی سطح پر لہریا بن گئی تھی اور اُن کی تازہ مٹی سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ ہریا کو محسوس ہوا جیسے وہ کسی نئی نویلی دلہن سے ملنے آئی ہے۔ جو زبان سے تو کچھ نہیں بولتی، مگر جس کے دل میں بار بار گدگدی ہوتی ہے اور چہرے پر مسکراہٹ پھیلنے لگتی ہے۔

پلٹتے ہی گاؤں کا ایک کسان ملا۔ اس نے دیکھتے ہی ہریا کو مبارک باد دی اور طعن بھی کی۔ وہ بولا "لیو بھوجی! ہر لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ تم ٹانگ پسارے سووت رہیو اور چھیدا تہار سب کام کر دہ ہن! کیسنو بدماس ہو، ہریا کے آگے سب کی نانی مرت ہے"۔

ہریا نے گھور کر دیکھا اور آگے بڑھ گئی۔ پہلے کھیتوں سے بھی ہل نکل چکے تھے۔ ہریا ان میں گھوم گھوم کر ان کی حالت دیکھتی رہی۔ کنکر پتھر ان میں سے چن کر باہر پھینکتی رہی اور بڑے بڑے مٹی کے ڈھیلوں کو توڑ کر انہیں چوری کرتی رہی مگر دل میں نہ جانے کیسے کیسے خیالات آتے رہے۔ چھیدا بڑا اچھا، چھیدا نے اس کے کہے بغیر اس کے کھیت جتوا دیئے۔ چھیدا اپنی بات پر اَڑنے والا مرد ہے۔ چھیدا، چھیدا، چھیدا! بس اسی کی صورت، اسی کی باتیں، اسی کا دھیان اور گوشائیں پور والے سب چلے گئے۔ ہریا نے کسی کو کچھ کھلایا پلایا بھی نہیں، کوئی خاطر بھی نہ کی۔ کسی سے ہنس کر بولی تک نہیں اور چھیدا ..... اس کی سانسیں سینے میں اٹکنے سی لگیں۔ اس کا چہرہ کبھی سُرخ ہو جاتا، کبھی زرد، اس کے جسم میں ہلکی سی کپکپی پیدا ہو جاتی، وہ گھبراتی رہی الجھتی رہی۔ چھیدا کے احسان کا بدلہ کیسے اتارے۔ یہی سوچتی رہی۔ وہ پسینے میں بھیگ گئی اور گردن جھکائے سوچتی گھر پلٹی۔ دیکھا تو اس کے جانور پاس والے باغ میں چر رہے ہیں۔ اس کے بیلوں کی سونی ناندوں پر دو خوبصورت بڑے بڑے بیل بندھے ہیں۔ بالٹیوں میں کہتریوں میں دودھ بھرا رکھا ہے اور اسی کے چھپر میں اسی کے کھاٹ پر چھیدا بے خبر سو رہا ہے۔

ہریا جلدی سے رسوئی گھر میں گھس گئی۔ اس نے چولہا جلایا اور آٹے میں خوب گھی ملا کر کئی موٹی موٹی خستہ اور بُھربھری ٹکیاں سینکیں۔ اس نے یہ ٹکیاں پھول کی تھالی میں رکھیں اسی میں گڑ کی بھیلی رکھی اور بہت سا سوندھا سوندھا کچا گھی اور بڑا سا گلاس بھر کر دودھ، وہ ایک ہاتھ میں یہ تھالی اور دوسرے میں پانی سے بھرا ہوا لوٹا لیے ہوئے چھیدا کے پلنگ کے پاس آئی۔ اس نے گھٹنوں سے اس کے کھاٹ کی پٹی ہلائی اور بولی۔

"کب تک سوائی ہو۔ اٹھو منہ ہاتھ دھو کے کچھ کھا لیو!"

اس کے لہجہ میں وہی نرمی، وہی گرمی۔ وہی شیرینی اور وہی سپردگی تھی جو ہندوستانی عورت کی آواز میں اپنے پتی ہی کے لیے ہو سکتی ہے۔!

* * * * * * * * * * * * * * * * * * * *

سوال و جواب



شفیق الرحمان

پرچے کے اجرا کو کچھ عرصہ گزرا ہوگا کہ خریداروں سے ہر موضوع پر سوال موصول ہونے لگے۔ ان ہی دنوں ہم پرچے کی فروخت بڑھانے کے متعلق سوچ رہے تھے کہ جب تک سوال جواب کا کالم اور معمّے نہ ہوں پرچہ زیادہ نہیں بک سکتا چنانچہ ہمیں سوال اور جواب کا سلسلہ شروع کرنا پڑا۔

یہ بڑا مشکل کام تھا۔ کسی سوال کے لئے حکیموں سے مشورہ لینا پڑتا تو کسی کے لئے فلم ڈائریکٹر سے۔

تیسرے سوال کا جواب کوئی درزی ہی دے سکتا تھا۔ تو چوتھے کا ماہر نفسیات، پانچویں کا باورچی۔ کیسا ہی سوال پوچھا گیا ہم نے کسی نہ کسی طرح اس کا موزوں ترین جواب بہم پہنچایا۔ نیز اس سلسلے میں جو خط و کتابت ہوئی وہ مکمل طور پر صیغہ راز میں رکھی گئی۔ فقط سوال پوچھنے والوں کے نام اور پتے شائع کر دیئے جاتے تھے بس۔

پتہ نہیں کیوں سوال پوچھنے والوں کا جوش و خروش کم ہونے لگا۔ چند ہی مہینوں میں سوال آنے ختم ہو گئے اور ہمیں مجبوراً وہ کالم بند کرنا پڑا۔ ہم اس کی وجہ نہیں سمجھ سکے۔ یہ تو نا ممکن ہے کہ صرف تین چار مہینے میں خریدار اتنے سمجھدار ہو گئے ہیں کہ انہیں کسی مشورے کی ضرورت نہیں رہی۔

پرانے پرچوں کی ورق گردانی کرتے وقت ہمیں خیال آیا کہ استفسارات و جوابات کا کچھ حصّہ ناظرین کی یاد دہانی کے لئے دوبارہ پیش کیا جائے۔ شاید یہ سلسلہ پھر جاری ہو سکے۔

س ۔ ہمارا گھوڑا علیل ہے مگر دوائی نہیں کھاتا۔ پانی میں گھول کر دانے میں ملا کر سامنے رکھتے ہیں تو سونگھ کر چھوڑ دیتا ہے۔ زبردستی منہ میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں تو کاٹتا ہے۔

گھوڑا ڈاکٹر نسخہ تجویز کر کے سبکدوش ہو چکے ہیں بڑی مصیبت میں گرفتار ہوں کچھ بتائیے۔

ج ۔ یہ تو بہت آسان ہے۔ بانس کا کھوکھلا ٹکڑا لے کر اس میں دوائی ڈال دیجئے۔ ایک سرا گھوڑے کے منہ میں دے کر دوسرے میں پھونک ماریئے دوائی اس کے حلق میں ہوگی لیکن ذرا جلدی کیجئے۔ اگر خدانخواستہ کہیں گھوڑے نے پہلے پھونک مار دی تو دوائی آپ کے حلق میں ہوگی۔

س ۔ چند ماہ ہوئے مشہور ایکٹریس ایوا گارڈنر نے بیان دیا تھا کہ اس کے حسن و جمال کا راز آٹھ گھنٹے کی نیند میں مضمر ہے۔ جب سے یہ پڑھا ہے۔ میں خوب سوتی ہوں۔ رات کو دس گھنٹے کی نیند پھر چار گھنٹے کا قیلولہ۔ بلکہ اب تو پندرہ سولہ گھنٹے روز سو لیتی ہوں۔ مگر اب تک کچھ نہیں ہوا۔

ج ۔ ایوا گارڈنر نے کچھ سوچ کر ہی بیان دیا ہوگا۔ آپ خوب سوئیے کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔

س ۔ پرانے زمانے میں لوگ بڑی لمبی عمریں پاتے تھے۔ نوے، سو برس تک زندہ رہنا بڑی عام بات تھی۔ درازی عمر کا اصل راز کیا تھا؟

ج ۔ پرانے زمانے میں ذرائع آمد و رفت محدود ہونے کی وجہ سے بسوں کے حادثے نہیں ہوتے تھے نہ رسالے تھے اور نہ زندگی سے بیزار کر دینے والا ادب تھا۔ اخبار کی عدم موجودگی لوگوں کو سیاسی خبروں سے محفوظ رکھتی تھی۔

سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ پرانے زمانے میں انکم ٹیکس والے نہیں تھے۔

س ۔ میرا بچہ ایک عرصے سے کمزور ہے۔ کچھ طبیب کہتے ہیں کہ تلی بڑھی ہوئی ہے۔ دوسرے کہتے ہیں کہ تلی نہیں بڑھی ہوئی ہے۔ عجب تماشہ ہے۔

ج ۔ آپ بچّے سے بھی تو پوچھئے وہ کیا کہتا ہے؟

س ۔ مجھے گدگدی بہت ہوتی ہے۔ بہتیرا ضبط کرتا ہوں اپنے آپ کو سمجھاتا ہوں لیکن کوئی فرق نہیں پڑتا بعض اوقات تو بڑی خفت اٹھانی پڑتی ہے۔ کوئی علاج بتایئے۔؟

ج ۔ گدگدی بچوں کو ہوا کرتی ہے۔ قاعدے کی رو سے بالغ انسان کو گدگدی نہیں ہونی چاہیئے۔ ہمارا یہ مشورہ ہے کہ آپ ایسے حالات نہ پیدا ہونے دیں جن میں گدگدی ہونے کا احتمال ہو۔ بہتر ہوگا کہ کسی ماہر نفسیات سے مل کر تجزیہ نفسی کرا لیں (ماہر نفسیات کو زیادہ قریب نہ آنے دیں) ویسے آپ کو گدگدی کون کرتا ہے؟

س ۔ میرے دوست حمید اللہ کے ہاں پندرہ برس کے بعد فرزند تولد ہوا ہے ہم سب از حد مسرور ہیں آپ سے درخواست ہے کہ بچے کا کوئی اچھا سا ایرانی وضع کا نام تجویز فرمائیں۔ مدنظر رہے کہ اتنے طویل عرصے کے بعد مبارک ساعت آئی ہے۔

ج ۔ بچّے کا نام دیر رکھئے۔ یعنی دیر حمید اللہ آپ نے سنا ہوگا۔ دیر آید درست آید۔

س ۔ پرانے زمانے میں لیلےٰ مجنوں، رومیو جولیٹ اور ہیر رانجھا جیسی لافانی ہستیاں گزری ہیں۔ پتہ نہیں اب ایسے لوگ کیوں نہیں پیدا ہوتے۔

ج ۔ جولیٹ کی عمر تیرہ برس تھی۔ رومیو پندرہ سال کا تھا۔ لیلیٰ پرائمری اسکول میں پڑھتی تھی، مجنوں اس سے دو تین سال بڑا۔ ایسے لوگ اب بھی پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن لڑکپن میں پڑھائی اور امتحان سر پہ سوار رہتے ہیں اور جوانی میں فکر معاش لے بیٹھتا ہے۔



ایک سوال

افسانہ

مشرف احمد

عقب جیکب لائنز کی جو ٹانگے اور رکشا والوں کی زبان میں بی ہینڈ کہلاتی ہے۔ ٹیڑھی میڑھی لکڑیوں، تختوں اور کالے رنگ کے ٹین سے بنی ہوئی جھگیوں کے جنگل میں کہیں کہیں کلرکوں کے یرقانی رنگ کے کوارٹر سر بلندی سے کھڑے ملتے ہیں۔ ہمارے شاعروں کے نزدیک موت سے رگِ جاں تک فاصلے کی کوئی اہمیت ہو یا نہ ہو لیکن کوٹھیوں بنگلوں اور بے پناہ ٹریفک کے ہونکتے ہوئے اس عظیم الشان شہر میں جھگی نشینوں کے درمیان گھرے ہوئے بابو اپنے ہمسایوں سے دور بھی ہیں اور نزدیک بھی۔ بابوؤں کے کوارٹروں سے پانی لے جانا جھگی نشین اپنا حق سمجھتے ہیں اور بابوؤں نے ان کے اس حق اور دوسرے بہت سے حقوق کو تسلیم کر لیا ہے۔ البتہ جب کبھی کبھی بابو غلط قسم کے احساسِ برتری کا شکار ہو کر جھگی نشینوں کے خلاف کوئی اقدام کرتا ہے تو افسرانِ بالا کے رویّے کے برعکس جھگی نشینوں کی بالٹیاں، گالیاں اور ڈنڈے اس کا سواگت کرتے ہیں۔

میرا یعنی بابو معراج دین کا کوارٹر بھی جھگیوں کے اسی جنگل میں تمام تر انفرادیت لیے ہوئے کھڑا ہے۔ میں اپنے کوارٹر کی اندرونی دنیا میں آزاد ہوں۔ البتہ جب میری بیوی اپنے کوارٹر کا صحن دھونے لگتی ہے تو وہ بائیں جانب والی جھگی کے لوگوں کو خبردار کر دیتی ہے کہ وہ اپنے کھانے پکانے کے برتن اوپر رکھ لیں اور سامان کہیں اٹھا کر رکھ لیں کیونکہ میرے کوارٹر کے گٹر کو بدہضمی ہو گئی ہے اور وہ زیادہ پانی برداشت نہیں کر سکتا۔ جھگیوں کے اس جنگل، اس کی تنگ و تاریک پگڈنڈیوں، کیچڑ اور گندگی کے خودرو نالوں کی زندگی عجیب و غریب ہے۔ اگر صدر دواخانے کے پاس سے پندرہ پیسے فی سواری کے ٹانگے یا سیکس سیٹر (چھ نشستوں والی موٹر رکشا) میں بیٹھا جائے تو سینٹ پیٹرک اسکول اور گرجا کے درمیان والی سڑک سے گزرتے ہوئے آپ تھانے کو عبور کریں گے اور پھر عقب جیکب لائنز کی آخری چوراہا نما سڑک پر اتریں گے اسی طرف بائیں جانب رات کے وقت آپ کو مسجد کے تنہا مینار کی بلند و بالا جالیوں میں جلتا ہوا سبز رنگ کا بلب نظر آئے گا۔ رات کے تاریک آسمان کے پس منظر میں مینار کا نچلا حصہ جھگیوں کے درمیان گھرا ہونے کے سبب آنکھوں کو فریب دیتا ہے۔ اور سامنے صرف ایک سبز رنگ کا جھروکہ نظر آتا ہے۔ اس سبز جھروکے کو روزانہ رات گئے واپس آتے وقت دیکھ کر میں اپنے دل کو تسلی دیتا ہوں کہ جب تک حج پر جانے کے لیے رقم حاصل نہیں ہو جاتی۔ اس وقت تک اس سبز گنبد سے دل بہلاؤں۔ یہ سوچتے ہوئے مجھے ہمیشہ اپنے ایک واقف کار کا خیال آتا ہے۔ جو گزشتہ سال رشوت سے پاسپورٹ بنا کر بذریعہ ہوائی جہاز حج بیت اللہ سے فارغ ہوا ہے اور جس نے واپسی پر آبِ زمزم اور کھجوریں مجھے تحفے میں دیتے ہوئے کہا — ”ہاں صاحب جس کو مدینے کی سرکار بلالے !“

اگر میرے کوارٹر کے مین گیٹ کی پتلی سی نالی کو بند کر دیا جائے تو مجھے چھت سے پھلانگ کر باہر نکلنا پڑے گا۔ مگر میری خوش قسمتی سے اس تنگ راستے میں ایک پلنگ بھی نہیں بچھ سکتا۔ لہٰذا تمام تر خواہش کے باوجود میں یا کوئی اور اس جگہ کو جھگی میں نہیں بدل سکتا۔ البتہ میرے برابر کی جھونپڑی کے ہوس پرست لوگوں نے رات کے وقت اپنی فالودے کی ریڑھی کو ٹیڑھا کر کے کھڑا کرنا شروع کر دیا تھا جس کے نتیجے میں مجھے روز رات کو اٹھ کر ریڑھی کے پہیوں کی ہوا نکالنا پڑتی۔ آخر وہ لوگ ہار گئے اور ریڑھی یہاں کھڑی کرنا چھوڑ دی۔

حکومت کی طرح مجھ اور میرے جیسے دوسرے کوارٹر والوں کو غیر آباد لوگوں کی آبادکاری سے کافی ہمدردی ہے۔ چنانچہ اپنے کوارٹر کے اردگرد کی زمین کی بہت ساری جھگیوں کا قیام اور ان میں رہنے والوں کی آبادکاری میری ہی مرہونِ منت ہے۔ مجھے اس ملک میں آ کر بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح پرمٹ اور لائسنس تو نہیں ملے۔ البتہ اس بات



کی آزادی ضرور ملی کہ میں جو جگہ خالی پاؤں اس پر قبضہ کر لوں۔ چنانچہ آج تک میں نے سرکنڈوں، گھاس پھونس اور کچّی اینٹوں کی بہت سی جھگیاں بنائیں اور وقتاً فوقتاً ضرورتمند لوگوں کو معقول معاوضے پر فروخت کر کے ان کی آبادکاری اور اپنی بنکاری کرتا رہا ہوں۔ آج میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے، جو خود بھی مشرقی پنجاب کا ایک مہاجر ہوں بہت سے مہاجروں کی غیر مستقل آبادکاری کی ہے۔ غیر مستقل آبادکاری میں میرا اور میرے جیسے دوسرے بہت سے عزائم پسند جھگی نشینوں کا بڑا فائدہ ہے۔ اس لیے ہم کوشش کر کے غیر آباد اور جھگی نشین ہی رہنا چاہتے ہیں۔ جھگیوں کی اس دنیا میں آباد نوجوانوں کا فائدہ یہ ہے کہ وہ آتے جاتے، جھگیوں میں رہنے والی عورتوں، لڑکیوں کو نہاتے، کپڑے دھوتے، کھانا پکاتے حتیٰ کہ حوائج ضروریہ سے فارغ ہوتے دیکھ سکتے ہیں، ایک دوسرے کے خلاف انتقامی کارروائی کے جذبات رکھنے والے اس لیے ان جھگیوں میں رہنا چاہتے کہ وہ کسی بھی وقت اپنے دشمن کی جھگی کو نذرِ آتش کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وسیع تر اور اجتماعی فائدہ یہ ہے کہ باہمی صلاح مشورے سے کسی بھی وقت پوری بستی میں آگ لگا کر کورنگی یا نیو کراچی میں کوارٹر، یا گودھرا کیمپ میں پلاٹ حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس آتش خود ساختہ میں بعض گمنام سیاست دانوں کا بھی فائدہ ہو جاتا ہے اور وہ گوشہ گمنامی سے نکل کر کاروں جیپوں میں معائنہ کرتے ہیں اور دو چار اخباری بیانات دے دیتے ہیں۔

میرے اردگرد پھیلا ہوا جھگیوں کا جنگل دو مرتبہ آباد ہو چکا ہے۔ لیکن کراچی میں جھگیاں کینسر کی طرح ہیں جو آپریشن کے بعد بھی اپنا روٹ نہیں چھوڑتا اور آدمی کو دوبارہ آ گھیرتا ہے۔ جھگیوں کی پہلی عظیم منتقلی میں مَیں نے اور میرے کوارٹر سے ملحقہ جھگی والے نے خوب ہاتھ رنگے تھے۔ آبادکاری کا اعلان سُن کر سرکاری کلرکوں کی آمد سے قبل اس نے اپنی جھگی کو دو جھگیوں میں تقسیم کر دیا تھا اور راشننگ آفس سے دو راشن کارڈ بنوا لیے تھے۔ ان ہنگامی دنوں میں راشن کارڈ جاری کرنے والوں کے ریٹ بھی بڑھ جاتے ہیں چنانچہ اگر کبھی کوئی راشننگ آفس کا کلرک راشن کارڈ بنانے میں لیت و لعل سے کام لے رہا ہو تو سمجھ جائیے کہ کہیں جھگیوں کی منتقلی شروع ہو رہی ہے۔ میں بھی دوسری بار اپنے کوارٹر کے بائیں جانب والی جھگی کے ایک حصّے کا مکین بن گیا۔

"کے۔ ڈی۔ اے" والے ایک روپے کی چار فوٹو کھینچنے والے کیمرہ مین کو لے کر آئے اور جھگیوں کے درمیان کی لمبی بل کھاتی سڑک پر اپنا دفتر جما کر بیٹھ گئے۔ مختلف جھگی والے باری باری سے آتے، گلے میں کے ڈی اے کے کلرک کا دیا ہوا نمبر ڈال کر میری دی ہوئی کرسی پر فوٹو گرافر کے سامنے بیٹھتے اور پرچی حاصل کر کے چلے جاتے۔ اپنی باری آنے پر میں بھی جھگی نشینوں کی طرح کرسی پر بیٹھا اور فوٹو کھنچوا کر کوارٹر کی پرچی حاصل کر لی۔ اس کے بعد میری بیوی خود کو بیوہ ظاہر کر کے، شیر علی کی بیوی کا بوسیدہ برقع اوڑھ کر کرسی پر بیٹھی اور ایک کوارٹر حاصل کر لیا۔ کے۔ ڈی۔ اے کے کلرکوں کے قریب ہی محلّے میں میرا سیاسی اور سماجی رقیب محمد عمر بھی کھڑا تھا لیکن اور دنوں کی طرح آج مجھے اس سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ اس لیے کہ ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے اور میں جانتا تھا کہ اگر میں نے اور میری بیوی نے دو کوارٹر حاصل کیے ہیں تو وہ تین کوارٹر الاٹ کرا چکا ہے۔ اس پر امن بقائے باہمی نے ہم دونوں کے راز کو تحفظ دیا تھا۔

شیر علی درزی دوبارہ کوارٹر الاٹ کرا چکا ہے اور دونوں دفعہ فروخت کر کے اپنی جھگی میں ہی رہتا ہے۔ اس کی جھگی کے برابر ہی میری ایک اور جھگی ہے۔ میں خود تو کوارٹر میں رہتا ہوں اور اس جھگی کو کرائے پر چڑھائے رکھتا ہوں۔ آج کل یہ جھگی خالی ہے کیونکہ پچھلے دنوں میں نے اپنے دونوں نوجوان کرایہ دار لڑکوں کو نکال دیا ہے۔ شیر علی درزی اور میری جھونپڑی کے درمیان جو سرکنڈوں اور ٹین کی دیوار ہے۔ وہ اس قابل نہیں ہے کہ ممنوعہ آوازوں کو اِدھر اُدھر جانے سے روک سکے۔ شیر علی کو تمام دن مشین چلانے کی عادت ہے اور جب رات کو اس کے بازو مشین چلانے سے فارغ ہوتے ہیں تو وہ زبان چلاتا ہے اور پاس پڑوس میں آ کر بیٹھ جاتا ہے۔ شروع شروع میں شیر علی اور میری جھونپڑی کے کرایہ دار لڑکوں میں خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ وہ ان کی پڑھائی میں حارج ہو کر رات کو گیارہ بجے تک ان کا مغز چاٹتا اور پھر جاتے ہی ممنوعہ آوازوں کی تخلیق میں مصروف ہو جاتا۔ شیر علی اب نوجوان تو نہیں رہا لیکن وہ ہر چیز کو مشین کی طرح استعمال کرنا چاہتا ہے۔ یہ دونوں نوجوان باری باری جھگی کی درمیانی دیوار کے سوراخ سے دوسری جانب جھانکتے تھے۔ شیر علی نے مجھ سے شکایت کی۔ میں نے لڑکوں کو منع کیا تو انہوں نے جواب دیا "کم از کم وہ ہمارے سونے تک تو صبر کر لیا کرے، ہم بھی جوان آدمی ہیں جی!" لیکن مشکل یہ ہے کہ شیر علی ہمسائے کا تو کیا خیال کرے گا۔ وہ اپنی اولاد کو بھی سوتا جاگتا نہیں دیکھتا وہ تو بس درزی ہے جسے مشین سے پیار ہے۔ ہم غریبوں کے محلّے میں بہو بیٹیوں کی عزت جلد خطرے میں پڑ جاتی ہے کیونکہ ہم اپنے بہو بیٹیوں کے شوہروں کو زیادہ جہیز دے کر منہ بند نہیں کر سکتے لہٰذا لڑکیوں کا کورا نیڈا" دیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے دونوں لڑکوں کو فی الفور اس کوارٹر سے نکال دیا۔

شیر علی کا لڑکا شریف اپنا آبائی پیشہ اختیار کرنا نہیں چاہتا۔ شریف میرے سامنے کا بچہ ہے۔ البتہ قد و قامت کے اعتبار سے وہ اتنی تیزی سے بڑھا ہے جس قدر تیزی سے کراچی کے کھلے اور لاوارث میدانوں میں جھگیوں کا شہر آباد ہوتا ہے۔ اس لڑکے کو قرآن شریف سے لے کر میٹرک تک مَیں نے پڑھایا ہے۔ شروع شروع میں جب شیر علی نے اپنے لڑکے کے لیے مجھ سے ٹیوشن کی بات کی تو مَیں نے انکار کیا۔ گو مَیں خود کلرک ہوں لیکن ٹیوشن پڑھانے والوں کے لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ وہ کبھی مفلوک الحال طبقے کے بچوں کا ٹیوشن نہ کریں کیونکہ مہینہ ختم ہونے کے بعد لڑکے کا باپ یا ماں یا خود لڑکا مقررہ رقم سے آدھی دے کر درخواست کرے گا "امی کہہ رہی ہیں کہ باقی پیسے اگلے مہینے ساتھ دے دیں گے۔ مفلوک الحال لوگوں کی یہ جبری عادت ہر آدمی کے لیے تکلیف دہ ہوتی ہے۔ ماسٹر اور پرچون فروش دونوں کی ادائیگی میں یہ ایک ہی معذرت آمیز اور ملتجیانہ لہجہ اختیار کرتے ہیں۔ میں نے شیر علی سے کہا کہ میں تمہارے لڑکے کو مفت پڑھا دوں گا۔ زیادہ سے زیادہ تم عید بقر عید پر میرا جوڑا مفت سی دیا کرنا۔ لیکن وہ نہ مانا۔ خیر محمد شریف نے پڑھنا شروع کر دیا۔ جب مہینہ ختم ہوا تو ایک دن شیر علی نے شریف کے ہاتھ ڈھائی روپے ٹیوشن فیس کے بھیجے۔ مجھے غصّہ بھی آیا اور حیرت بھی ہوئی مَیں نے وہ پیسے واپس بھیجے تو شیر علی کی بیوی ڈھائی روپے میں چونی اور ملا کر لائی اور بولی —— "شریف کے ابا کہہ رہے ہیں پونے تین روپے کافی ہیں ہم بھی گریب آدمی ہیں ماسٹر جی!" میں نے اس پر اپنی پوزیشن واضح کرتے ہوئے کہا —— "میں ماسٹر جی نہیں ہوں بابو معراج دین ہوں!"

ہر چند شیر علی کا گھرانہ میرا احسانمند ہونا نہ چاہتا تھا لیکن میں بھی پونے تین روپے قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ اصل میں اس شیر علی کا بھی قصور نہیں ہے۔ شیر علی لاکھ دیہاتی

زندگی بھول کر شہری زندگی کا عادی ہو گیا ہو ۔ وہ دھوکے اور فریب سے مہاجروں کے کوارٹر الاٹ کرا لیتا ہے لیکن جس طرح بیل باٹم پاجامہ اور سلیولیس قمیض پہننے والی جدید ترین مشرقی لڑکی اپنے جسمانی تحفظ کے اعتبار سے سو سال پہلے کی بی بیبیوں کے انداز میں سوچتی ہے ۔ اس طرح شیر علی بھی بعض باتیں اپنے ذہن سے نہیں نکال سکا ہے اس کے ذہن میں ابھی تک تیس چالیس سال پہلے والے ماسٹر کا تصور موجود ہے جو میاں جی کہلاتا تھا اور گندم کے دانوں ، نذر نیاز اور شام کی روٹی پر گزارا کرتا تھا ۔

شیر علی پاکستان بننے کے بعد گو خود بھی کافی بدل گیا ہے لیکن وہ نوجوان نسل کے رویّے کا شاکی نظر آتا ہے ۔ وہ اپنی معصومیت جتاتے ہوئے کہتا ہے ۔ تیرہ چودہ سال کی عمر تک ہم گاؤں میں لڑکے لڑکیاں اکٹھے ننگے نہاتے تھے لیکن شیر علی کا بیٹا شریف جوان ہونے کے بعد کپڑے پہنے ہوئے لڑکیوں کو بھی اس طرح دیکھتا ہے گویا وہ ننگی ہیں۔

شیر علی کی آنکھیں اور شریف کا لڑکپن ایک ساتھ ختم ہوا ۔ جب شریف نے میٹرک پاس کر لیا تو میرے مشورے کے مطابق اس نے باپ کی مشین پر بیٹھنے کے بجائے ٹائپ سیکھنا شروع کر دیا تاکہ وہ دفتر میں بابو ہو سکے ۔ شریف قسمت کے اعتبار سے بھی شریف ہے ۔ کیونکہ بدمعاشوں کے اس معاشرے نے اسے اپنے اندر جذب کر لینے سے انکار کر دیا ہے ۔ محمد شریف اور میرے درمیان ایک فطری اُنس موجود ہے ۔ وہ دن بھر فٹ پاتھوں ، دفتروں اور دفترِ روزگار کے چکّر لگاتا اور شام کو ساری باتیں بتاتا ہے ۔ مَیں اس کی ڈھارس بندھاتا ہوں اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے بے اولاد رکھا ۔ کیونکہ مَیں ہندوستان میں اپنی بے روزگاری کے دِن اور باپ کا چہرہ نہیں بھولتا کبھی کبھی محمد شریف کو اداس دیکھ کر مَیں خود کو مجرم سمجھنے لگتا تھا ۔ یہ کافی پرانی باتیں ہو گئی ہیں ۔ کبھی کبھی مَیں اسے کہتا تھا کہ بیٹا ملازمتیں نامحرم عورتوں کی طرح ہیں جو کبھی کبھی ملتی ہیں ۔ خشک ملازمتیں وہ ہیں جو بنجر عورتوں کی مانند ہوتی ہیں ۔ جہاں کسی بالائی آمدنی کی توقع نہیں ہوتی اور "تر ملازمتیں" لاتعداد بچے جننے والی عورتوں کی طرح ہیں جنہیں حاصل کرنے والوں کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہوتی ہیں ۔ مگر زندگی میں کم اولاد والی یا بانجھ عورتیں اور تر ملازمتیں امیروں کو ملتی ہیں اور خشک ملازمت اور تر عورت صرف غریب کو ! اب حالات خراب ہو گئے ہیں ۔ اکثر مَیں اس سے وہی فقرا کہا کرتا تھا جو تقریباً ہر وہ شخص اس سے کہتا تھا جس کے پاس وہ ملازمت کی غرض سے جایا کرتا تھا ۔

ایک دن جب وہ بہت اداس اور ملول تھا تو میں نے اسے بتایا کہ مجھے بھی ملازمت قسمت سے ملی تھی ۔ اگر ہندوستان تقسیم نہ ہوتا اور پاکستان کا نیا ملک نہ بنتا تو مَیں بھی جالندھر، دہلی اور بمبئی کی سڑکوں پر ہَوا پھانکتا ہوا مر جاتا ۔ جب پاکستان بنا تو مَیں یہاں آ گیا ، جہاں مجھے ایک سرکاری دفتر میں ملازمت مل گئی ۔ مَیں نے اسے بتایا کہ شروع شروع میں جن لوگوں کے ساتھ کام کرتا تھا وہ ایک مشین کی سی لگن کے ساتھ کام کرتے تھے ۔ اس زمانے میں ان لمبی لمبی پیلی بیرکوں ، میز کرسیوں اور افسروں کے کمروں کا دُور دُور تک نام و نشان نہ تھا ۔ درختوں کے نیچے زمین میں چٹائیاں بچھا کر اور سرکنڈوں میں ٹب لگا کر ہم کام کیا کرتے ۔ پھر رفتہ رفتہ سب کچھ بن گیا ۔

" تو کیا اس زمانے میں ملازمت مِل جاتی تھی —— ؟ " محمد شریف نے مجھ سے حیرانی میں ڈوبے ہوئے سوال کیا ۔

" بڑی آسانی سے ! ملک نیا نیا بنا تھا نا !!! " میں نے جواب دیا ۔ وہ یہ سُن کر کچھ سوچنے لگا ۔

اس گفتگو کے بہت دنوں بعد ایک دن ، ہماری جھگیوں میں یہ خبر آئی کہ لالو کھیت دس نمبر سے آگے کریم آباد کے ریلوے پُل کراسنگ کے نزدیک اپوا کالج کے سامنے کے میدان میں جھگیاں ڈالی جا رہی ہیں ۔ مَیں نے شریف کو بلایا ۔ اب شریف ہی میرا ساتھ دے سکتا تھا ۔ کیونکہ شیر علی آنکھوں سے محروم ہو جانے کے بعد جھگی نہیں ڈال سکتا تھا نہ زمین پر قبضہ کر سکتا تھا ۔ ایک دن مَیں اور شریف دونوں جا کر صورتِ حال کا جائزہ لے آئے ۔ جھونپڑیاں ڈلوانے کا ٹھیکیدار سب امیدواروں سے پچاس پچاس روپے لے رہا تھا ۔ دن میں ہم نے چٹائیاں ، بانس ، سرکنڈوں کی چھپریاں ، چار کورے گھڑے ، دو لالٹینیں اور دو چارپائیاں خریدیں اور رات کو شیدو کی گدھا گاڑی میں سارا سامان لاد کر ٹھیکیدار کی بتائی ہوئی جگہ پر بلیاں گاڑ کر جھونپڑیاں بنا لیں ۔ دوسرے دن جب مَیں اور محمد شریف اپنی اپنی جھونپڑیوں سے سو کر اٹھے تو ہماری نگاہوں کے سامنے جھونپڑیوں کا ایک نیا جنگل آباد ہو چکا تھا ۔ اپوا گرلز کالج کی سُرمئی دیوار کے ساتھ ساتھ جھگیوں نے پھیل کر ، کالج کی دیواروں پر لکھے ہوئے مردانہ ، زنانہ امراض کے اشتہاروں کو پوشیدہ کر دیا تھا ۔ اس روز کے سورج نے گلیوں میں کھیلتے بچوں اور جھگیوں سے دھواں ابھرتا ہوا موسیٰ کالونی پر پہلی بار اپنی کرنیں نچھاور کیں ۔

چند دن اسی طرح گزر گئے ۔ اور اب ہم تمام نو آبادکاروں کو بستی کے پکّا ہو جانے کا یقین ہو چلا تھا کہ ایک دن لاتعداد پولیس آئی اور ذرا سی دیر میں لاٹھیوں نے ان جھونپڑیوں کو توڑ پھوڑ ڈالا ۔ جھگی والوں نے پہلی بار شکست کھائی تھی ۔ کیونکہ اب کے ان کا مقابلہ غریبوں کی بستی یا کلرکوں سے نہ تھا بلکہ بڑی بیگمات سے تھا ۔ پل کی پل میں بانس ، چارپائیاں پولیس کے ٹرکوں میں تھے اور گھڑے ٹوٹے پڑے تھے ۔ مَیں اور محمد شریف نقصان اٹھا کر گھروں کو واپس آئے ۔

محمد شریف کو جھگیوں کے اس شہر کے تباہ ہو جانے کا بہت افسوس ہوا ۔ اس آبادی میں اس کا دل لگ گیا تھا ۔ اور جب دو چار دن وہ ملازمت کی تلاش کی ۔ کوفت سے بیچارہ ہا تو اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اب وہ نوکری کی تلاش کی بجائے ایسی نئی نئی جگہیں تلاش کیا کرے گا جہاں وہ جھگیاں ڈال سکے ۔ لیکن وہ پہلے ہی سودے میں گھاٹا لگا کر سخت دلِ برداشتہ ہو گیا ۔ ناتجربہ کاری بھی بڑی تباہ کن چیز ہے ۔ گو مَیں نے اسے لاکھ سمجھایا کہ تجارت میں نقصان ہوتا ہی رہتا ہے لیکن اپنے شہرِ آرزو کے تعمیر نہ کر سکنے کا انہ حد رنج ہوا ۔

اس واقعے کو کافی دن ہو گئے ہیں اور اس کی بیروزگاری کی مدت طویل ہو گئی ہے ۔ اب اس نے ذہنی توازن کھو دیا ہے اور کیپری سینما کے سامنے لڑکیوں کے اسکول کے برابر تعمیر روک کر گرا دیئے جانے والے ہوٹل کے ملبے کے ڈھیر کے پاس پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس بیٹھا ہوا آتے جاتے لوگوں کو روک کر وہ ان سے ایک ہی سوال پوچھتا ہے —— " نیا ملک کب بنے گا ؟ " میں اب اس کا سامنا نہیں کر سکتا کیونکہ دوسرے لوگوں کی طرح مَیں بھی اس کے اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا ۔



نعیم الحسن

آزادی کے مقدمات



بھگت سنگھ

ایک امر کہانی

لالہ لجپت رائے کو ایک انگریز

پولیس افسر نے ہلاک کیا تھا

بھگت سنگھ نے پھانسی کا پھندہ چُوم کر نعرہ بلند کیا : انقلاب زندہ باد

۷ر مئی ۱۹۲۹ء کی صبح اداس اور غم انگیز ہے۔

دہلی ——— غلام اور پابند سلاسل ہندوستان کا دارالخلافہ دہلی حزن و ملال کا مرقع بنا ہوا ہے۔ تحریک آزادی کے انقلابی رہنما بھگت سنگھ اور بھٹو کیشور دت کو ایک مقامی مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ ان دونوں رہنماؤں پر بم پھینکنے کا الزام تھا۔

بھگت سنگھ اور بھٹو کیشور دت کو جس وقت عدالت میں پیش کیا گیا اس وقت عدالت کے اندر اور باہر کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علم کھچا کھچ بھرے ہوتے تھے۔ انہوں نے ایک نظر منصف پر ڈالی اور زور دار آواز میں نعرہ بلند کیا ——— "انقلاب زندہ باد" ——— "سامراج مردہ باد" ——— یہ دونوں نعرے دیکھتے دیکھتے پورے ہندوستان کے شعلہ ذہن نوجوانوں میں مقبول ہو گئے۔

۲۳ر مارچ ۱۹۳۱ء کو بھگت سنگھ اور ان کے دو ساتھیوں کو لاہور سنٹرل جیل میں پھانسی دے دی گئی۔ دوسرے دن صبح کو تسلج کے کنارے تینوں انقلابی رہنماؤں کے مردہ جسم کو آگ کے سپرد کر دیا گیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا۔ آگ کے شعلے آسمان کی بلندیوں کو چھو رہے تھے۔ برطانوی سامراج نے ان کی زندگی چھین لی۔ مگر وہ ان کی اس چیخ اور للکار کا گلا نہیں گھونٹ سکا جس نے برطانوی سامراج کے راج سنگھاسن کو ڈانواں ڈول کر دیا تھا۔ جن لوگوں نے بھگت سنگھ اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو پھانسی کے پھندے پر لٹکتے ہوئے دیکھا، ان کا کہنا ہے کہ بھگت سنگھ اور دوسرے انقلابی مطمئن اور مسرور تھے اور پھندے کو گلے میں ڈالنے سے قبل اُسے چوم لیا تھا ——— وہ مرے نہیں امر ہو گئے۔

۸ر اپریل ۱۹۲۹ء کو لیجسلیٹو اسمبلی میں بم کا ایک پُراسرار دھماکہ ہوا جس کی صدائے بازگشت دہلی تک محدود نہ رہی۔ بھگت سنگھ اور ان کے دو کٹر کامریڈوں کی گرفتاری سے "سانڈرز" کے پُراسرار قتل کے معمّے کا سرا بھی پولیس کے ہاتھوں میں آگیا۔ جسے حل کرنے میں پنجاب پولیس کے اعلیٰ دماغ تھک گئے تھے۔

اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس سانڈرز کے قتل کے واقعہ کی کڑیاں لالہ لجپت رائے کی موت سے ملتی ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یوں ہے کہ ۱۰ر نومبر ۱۹۲۸ء کو سائمن کمیشن کے لاہور پہنچنے سے ایک روز پیشتر لالہ لجپت رائے کی قیادت میں نکلنے والے ایک جلوس سے پولیس کا تصادم ہو گیا۔ پولیس نے دل کھول کر لاٹھیاں چلائیں۔ لالہ جی کا سر کئی جگہ سے پھٹ گیا اور جسم کے کئی حصوں میں اندرونی چوٹیں آئیں

سائمن کمیشن کی آمد سے ایک روز قبل لاہور کی سڑکوں پر پولیس اور مظاہرین میں تصادم

جس سے لالہ لجپت رائے کی موت واقع ہو گئی۔ عوام میں یہ بات پھیل گئی کہ لالہ جی ایک پولیس افسر کے تشدد سے ہلاک ہو گئے۔ یہ بات تھی بھی درست۔ پولیس نے لالہ جی کی ضعیفی اور سیاسی مرتبے کا ذرا بھی خیال نہ کیا اور ان پر خونخوار دشمن کی طرح ٹوٹ پڑے۔

اس واقعہ کے ٹھیک ایک ماہ بعد یعنی ۱۷ دسمبر کو اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس سانڈرز چار بجے کے قریب لاہور ڈسٹرکٹ پولیس کے دفتر سے باہر نکلا۔ اس کے ساتھ ایک ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ سانڈرز نے اپنی موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کیا اور آہستہ رفتاری کے ساتھ سڑک پر روانہ ہو گیا۔ ٹھیک اسی وقت سڑک پر کھڑے ہوئے ایک پُراسرار نوجوان نے اس پر فائر کیا۔ گولی اس کے جسم کو چھید گئی اور وہ چکرا کر زمین پر گر پڑا۔ اسی اثناء میں ایک دوسرے نوجوان نے آگے بڑھ کر اپنے آٹومیٹک پستول کی بہت ساری گولیاں سانڈرز کے جسم پر خالی کر دیں۔

ہیڈ کانسٹیبل اور دوسرے پولیس والوں نے جو فائرنگ کی آواز سن کر اس جگہ پہنچ گئے تھے، پُراسرار نوجوانوں کا تعاقب کیا جو قریبی ڈی اے وی کالج کے احاطہ میں گھس گئے تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل چانن سنگھ انقلابی نوجوانوں کو پکڑنے کے زعم میں کالج کے احاطہ میں بے دھڑک گھس گیا ——— اچانک فائر ہوا ——— ایک سنسناتی گولی اس کی پسلیوں کو توڑتی ہوئی جسم کے اندر گھس گئی۔ اس واقعہ کے ایک گھنٹہ بعد چانن سنگھ نے بھی میو ہسپتال میں دم توڑ دیا۔

پولیس سپرنٹنڈنٹ سانڈرز کی موت کے بعد لاہور کے مختلف پبلک مقاموں پر بڑے بڑے پوسٹر چسپاں دیکھے گئے ——— "سانڈرز مر چکا ہے" ——— "لالہ جی کا انتقام پورا ہو گیا۔"

بھگت سنگھ کو جب گرفتار کیا گیا تو ان کی تحویل سے وہ آٹومیٹک پستول برآمد ہو گیا۔ جس سے سانڈرز پر دوسری بار گولیاں چلائی گئی تھیں۔ ان پوسٹروں کی بھی شناخت ہو گئی۔ جس پر بھگت سنگھ کی اپنی تحریریں تھیں۔ اس طرح پولیس بم کے واقعہ کی کڑیاں پولیس سپرنٹنڈنٹ سانڈرز کے قتل کے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئی۔ تاجِ برطانیہ کے نمک خواروں کو سرخرو ہونے کا موقع مل گیا۔ دہلی کے حادثے میں بھگت سنگھ اور بٹوکیشور دت کو عمر قید کی سزا کا حکم سنایا گیا۔ مگر ابھی لاہور کے مقدمے کا فیصلہ ہونا باقی تھا۔ برطانوی سامراج اور اس کے دلالوں کو اس سے بہتر موقع کہاں نصیب ہوتا۔ یہ بات طے کر لی گئی تھی کہ اس سے پہلے کہ یہ انقلابی آواز ہندوستان کے محنت کشوں کا انقلابی نعرہ بن جائے اس کا گلا گھونٹ دو ——— مار ڈالو، پھانسی دے دو ——— کچھ کرو، مگر انقلابی آواز کو دفن کر دو۔"

بھگت سنگھ اور ان کے دیگر انقلابی ساتھیوں پر مقدمہ چلانے کے لئے گورنر جنرل نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے ایک خصوصی ٹربیونل قائم کیا۔ انقلابیوں پر قتل اور تاجِ برطانیہ کے خلاف بغاوت کرنے کے سنگین الزامات عائد کئے گئے۔ خصوصی ٹربیونل کے سامنے جن ۲۴ افراد کو ملزم کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

سکھ دیو عرف دیال عرف سوامی عرف دیہاتی، کشوری لال رتن عرف دیو دت رتن عرف مست رام شاستری، دیس راج، پریم دت عرف ماسٹر عرف امرت لعل، جے دیو عرف ہریش چندر، شیو ورما عرف پربت عرف ہرنارائن عرف رام نارائن کپور، گیا پرشاد عرف ڈاکٹر بی ایس نگم عرف رام لعل عرف رام ناتھ عرف دیس بھگت، مہابیر سنگھ عرف پرتاپ، بھگت سنگھ، اجے کمار گھوش عرف نگیر و جنرل، جیتن سانیال (جتندر ناتھ سانیال)، بیجے کمار سنہا عرف بچو، شیو راج گرو عرف "ایم"، کندن لعل عرف پرتاپ ببرا، اور کنول ناتھ ترویدی عرف کنول ناتھ تیواری۔

مقدمے کی کارروائی ۵ مئی ۱۹۳۰ء کو شروع ہوئی۔ بھگت سنگھ اور ان کے دوسرے ساتھیوں پر انڈین پینل کوڈ کے سیکشن ۱۲۱ (جنگ یا بغاوت کا الزام) ۱۲۱-۱، ۱۲۲ اور ۱۲۳ کے تحت الزامات عاید کئے گئے۔ بھگت سنگھ، شیو رام راج گرو اور سکھدیو پر ۳۰۲ کے تحت بھی مقدمہ قائم کیا گیا۔

استغاثہ کے مطابق اگست ۱۹۲۸ء میں تاجِ برطانیہ کے خلاف بغاوت کا آغاز یوں کیا گیا کہ بہت ساری انقلابی پارٹیوں کو ایک انقلابی پارٹی میں مدغم کر کے انقلابی سرگرمیوں کا دائرہ پنجاب سے کلکتہ تک پھیلا دیا گیا۔ ——— بہار کی انقلابی پارٹی میں بھوپندر ناتھ گھوش (وعدہ معاف گواہ) من موہن بنرجی اور کنول ناتھ تیواری کے علاوہ دیگر کامریڈ شامل تھے۔ "یونائیٹڈ پروانس پارٹی" میں شیو ورما اور بیجے کمار سنہا تھے۔ بعد میں انہوں نے گیا پرشاد یا للت کمار مکرجی کے ذریعہ اجے کمار گھوش، جتندر ناتھ سانیال کو بھی پارٹی میں شامل کر لیا۔ لاہور پارٹی سکھ دیو، بھگت سنگھ، جے گوپال، ہنس راج وہرا، گیا پرشاد، مہابیر سنگھ اور کشوری لعل پر مشتمل تھی۔ ان تمام کامریڈوں میں ایک مفرور کامریڈ چندر شیکھر آزاد عرف پنڈت جی نے برطانوی سامراج کے خلاف غیر معمولی کارنامے انجام دیئے۔

ستمبر کے مہینے میں انقلابی پارٹی کی دہلی میٹنگ کے فیصلے کے مطابق بھگت سنگھ اور سکھ دیو فیروزپور گئے۔ اس موقع پر بھگت سنگھ نے اپنی داڑھی اور سر کے بال کٹوا دیئے تھے۔ ستمبر کے آخری ہفتے میں بھگت سنگھ اپنے وعدہ کے مطابق بیتیا (بہار کا ایک علاقہ) پہنچے، وہاں انہوں نے بھوپندر ناتھ گھوش سے ایک ڈکیتی کے سلسلے میں تفصیلی بات چیت کی۔ اس کے بعد وہ الٰہ آباد پہنچے اور اجے کمار گھوش کے کمرے میں للت کمار مکرجی اور بیجے کمار سنہا سے خفیہ مذاکرات کئے۔ اس میٹنگ میں بھگت سنگھ نے للت کمار مکرجی کو بتایا کہ انقلابی پارٹی قائم ہو چکی ہے۔ اس کے دو گروپ ہیں۔ ایک گروپ میں متحرک ممبران ہیں جب کہ دوسرے گروپ میں صرف ہمدردوں کو شامل کیا گیا ہے۔

بیتیا میں چندر شیکھر آزاد بھی بھگت سنگھ سے آملے۔ انہوں نے من موہن بنرجی کے مکان کے قریب ہی ایک کھنڈر میں بھوپندر ناتھ گھوش اور من موہن بنرجی سے ڈاکہ ڈالنے کے منصوبے پر تفصیلی بات چیت کی۔ من موہن بنرجی نے ان کے لئے کھانا فراہم کیا۔ اور ان کے نوکر راگھونی نے ایک لالٹین کا انتظام کیا۔ بھگت سنگھ نے الٰہ آباد کے انقلابیوں کے لئے بھوپندر ناتھ گھوش سے چند ریوالور حاصل کئے۔

۱۷ نومبر کو لالہ لجپت رائے انتقال کر گئے۔ چندر شیکھر آزاد عرف پنڈت جی ایک دوسرے کامریڈ مہابیر سنگھ کے ہمراہ فیروزپور سے لاہور پہنچے۔ پنڈت جی کے پاس ایک سوٹ کیس تھا جس میں ایک ماسر پستول اور چار ریوالور تھے۔ اس کے بعد سارے انقلابی ایک کے بعد ایک لاہور پہنچ گئے۔

یکم دسمبر ۱۹۲۸ء کو مزنگ ہاؤس میں سکھ دیو، ہنس راج وہرا، بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد عرف پنڈت جی، مہابیر سنگھ، شیو رام راج گرو، کیشوری لعل، جے گوپال اور کالی چرن دمعز ورساموجود تھے۔ اس خفیہ جلسے میں پنجاب نیشنل بنک لاہور کو لوٹنے کا پروگرام بنایا گیا۔ اس میٹنگ کے تیسرے دن پنڈت جی نے مزنگ ہاؤس میں اپنے ساتھیوں کو ریوالور لوڈ اور خالی کرنے کا طریقہ سکھایا۔

۴ دسمبر کو پنجاب نیشنل بنک میں ڈاکہ ڈالنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ پلان کے مطابق ۳ بجے بھگت سنگھ اور مہابیر کو کرائے کی موٹر کار میں بنک پہنچنا تھا۔ ہنس راج وہرا اور ایک دوسرے کامریڈ کو بنک کے چپراسی سے نمٹنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ کامریڈ کالی چرن کا کام تھا کہ وہ فوری طور پر ٹیلی فون کی لائن کاٹ دیں۔ سکھ دیو کو بنک کے چوکیدار سے بندوق چھیننی تھی۔ جب کہ چندر شیکھر آزاد عرف پنڈت جی کو کیشیر سے نمٹنا تھا۔ جے گوپال اور کیشوری لعل کو دو تھیلے دیئے گئے تھے جن میں کرنسی نوٹوں کو بھرنا تھا اس آپریشن کو تین مرحلوں میں مکمل کرنا تھا۔ پنڈت جی کے ذمہ یہ بھی کام تھا کہ ہر مرحلے کے آغاز اور انجام پر سیٹی بجا کر اپنے ساتھیوں کو خبردار کرتے رہے۔

۴ دسمبر کو بھگت سنگھ اور مہابیر ایک ٹیکسی کے ذریعہ شالامار گارڈن پہنچے اور پھر واپس ہوئے۔ وہاں سے مہابیر سنگھ ٹیکسی حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے۔ چنانچہ بھگت سنگھ اور مہابیر لارنس گارڈن

کے پاس رک گئے اور ایک ٹانگہ کے ذریعہ پنجاب نیشنل بنک پہنچے اور پنڈت جی کو اطلاع دی کردہ وقت پر ٹیکسی حاصل کرنے میں ناکام ہو گئے۔ اس طرح پنجاب نیشنل بنک میں ڈاکہ ڈالنے کا منصوبہ فیل ہو گیا۔

۵ دسمبر کو مزنگ ہاؤس میں کامریڈوں کی میٹنگ ہوئی۔ جس میں بھگت سنگھ موجود نہیں تھے۔ ۱۰ دسمبر کو بھگت سنگھ واپس لوٹے۔ ۹ اور ۱۰ دسمبر کو مزنگ ہاؤس کے خفیہ جلسے میں ایس۔ پی لاہور اسکاٹ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا جس کے تشدد سے لالہ لجپت رائے ہلاک ہو گئے تھے۔ اس جلسے میں چندر شیکھر آزاد عرف پنڈت جی، سکھ دیو، بھگت سنگھ، کیشور لعل، شیورام راج گرو، مہابیر سنگھ اور جے گوپال موجود تھے۔ اس میں تین افراد انقلابی پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے ارکان تھے۔ جے گوپال کو اسکاٹ کی نقل و حرکت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ ۱۵ دسمبر کو جے گوپال کی رپورٹنگ کی روشنی میں ۱۷ دسمبر کو دن کے دو بجے اسکاٹ کے قتل کا پروگرام طے کر لیا گیا۔

۱۵ دسمبر کی میٹنگ میں بھگت سنگھ نے مزنگ ہاؤس میں اپنے ساتھیوں کو پوسٹر دکھائے جن پر جلی حروف میں لکھا تھا "ہندوستان سوشلسٹ ری پبلک آرمی" اس کے نیچے ضمنی سرخی تھی ـــــ "اسکاٹ کا کام تمام ہو گیا" ـــــ بعد میں بھگت سنگھ کے ہاتھوں لکھے گئے۔ یہی پوسٹر لاہور کی دیواروں پر تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ چسپاں کئے گئے۔ ضمنی سرخی میں "اسکاٹ" کی جگہ "سانڈرز" کا نام تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جے گوپال نے جس آدمی کو اسکاٹ سمجھا تھا۔ وہ دراصل اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس سانڈرز نکلا۔ اسی دھوکے میں اسکاٹ کی جگہ سانڈرز مارا گیا۔

مقررہ تاریخ کو پنڈت جی نے پولیس اسٹیشن کے بالمقابل ڈی اے وی کالج کی عمارت کے اندر اپنا مورچہ سنبھال لیا۔ بھگت سنگھ اور شیورام راج گرو پولیس اسٹیشن کے قریب ہی سڑک پر اطمینان سے ٹہلنے میں مصروف تھے ـــــ چار بجے کے قریب اے۔ ایس۔ پی سانڈرز ایک ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ پولیس اسٹیشن سے باہر نکلا۔ اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے سڑک پر پہنچ گیا۔ ٹھیک اسی لمحے جے گوپال نے سر کے ہلکے اشارے سے شیورام راج گرو کو خبردار کیا۔ حملے کا سگنل ملتے ہی شیورام راج گرو نے اپنا ریوالور نکالا اور سانڈرز کی طرف گھوم کر فائر کر دیا۔

سانڈرز کا ایک ہاتھ زخمی ہو گیا۔ اور وہ موٹر سائیکل سمیت زمین پر گر پڑا۔ بھگت سنگھ برق رفتاری سے اس جگہ پہنچ گئے اور اپنے خود کار پستول کی کئی گولیاں سانڈرز کے جسم میں پیوست کر دیں۔ سانڈرز کو ہلاک کرنے کے بعد بھگت سنگھ، شیورام راج گرو اور جے گوپال کورٹ اسٹریٹ کی طرف فرار ہو گئے۔ ہیڈ کانسٹیبل چانن سنگھ اور ٹریفک انسپکٹر فرن ان کے تعاقب میں بھاگے ہوئے تھے۔ چانن سنگھ کو ڈی اے وی کالج میں گولی مار کر شدید زخمی کر دیا گیا۔ بعد میں وہ ہسپتال میں مر گیا۔

بھگت سنگھ، شیورام راج گرو، جے گوپال، پنڈت جی اور دوسرے ساتھی جو اس کام پر مامور تھے ڈی اے وی کالج میں گھس گئے اور پھر پچھلے دروازے سے باہر نکلے اور تقریباً ساڑھے پانچ بجے مزنگ ہاؤس میں پہنچ گئے۔ جب وہ فرار ہو رہے تھے تو سائیکل کی دکان کے مالک عطار محمد نے کچھ دور تک ان کا تعاقب کیا، مگر بعد میں وہ واپس ہو گیا۔ مقدمے کے دوران اس نے یہ واقعہ بیان کیا۔

مقدمے کی کارروائی ۵ مئی سے ۱۱ مئی ۱۹۳۰ء تک جاری رہی۔ اس کے بعد ٹریبونل نے ۱۲ مئی تک مقدمے کی کارروائی ملتوی کر دی۔ ۱۳ مئی کو مقدمے کی کارروائی دوبارہ شروع ہوئی تو ایک کے سوا باقی تمام کامریڈوں نے عدالت میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ ٹریبونل نے مجبوراً ۲۸ مئی کی تاریخ مقرر کی ـــــ مگر ۲۸ مئی کو بھی بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے عدالتی کارروائی میں حصہ لینے سے جبراً انکار کر دیا۔ ۲۱ جون کو استغاثہ کے ۲۵ گواہوں پر جرح کی گئی۔ ٹریبونل میں دو نئے ممبروں کو شامل کیا گیا ـــــ اسی دن بھی بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے عدالت میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ ۲۳ جون کی تاریخ مقرر کی گئی۔ اس طرح یہ سلسلہ ۱۰ جولائی تک چلتا رہا۔ ۱۰ جولائی کو تقریباً ۴۰ گواہوں پر جرح مکمل کر لی گئی۔ تین افراد کو بری الذمہ قرار دیا گیا۔

۴ اگست کو میڈیکل افسر کی شہادت ریکارڈ کی گئی۔ بھگت سنگھ کے دو ساتھی پریم دت اور کندن لعل

ڈی اے وی کالج کے سامنے

اسکاٹ کی جگہ سانڈرز کو قتل کر دیا گیا

بھوک ہڑتال کے سبب عدالت میں حاضری کے قابل نہ تھے۔ عدالت کی کارروائی ملتوی کر دی گئی۔ ۱۱ اگست کو بھگت سنگھ اور ان کے دوسرے ساتھیوں نے عدالت میں جانے سے انکار کر دیا۔ میڈیکل افسر کی شہادت سے پتہ چلا کہ سکھ دیو، بیجنے کمار سنہا اور بھگت سنگھ رضاکارانہ بھوک ہڑتال کے سبب، عدالت میں حاضر ہونے کے قابل نہیں تھے۔ چنانچہ عدالت نے بیجنے کمار سنہا اور سکھ دیو کو ۱۳ اگست اور بھگت سنگھ کو ۱۸ اگست تک عدالت کی حاضری سے مستثنیٰ قرار دے دیا۔ ۱۸ اگست کو بھی بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے عدالت میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ ۲۲ اگست کو میڈیکل افسر نے بتایا کہ بھگت سنگھ عدالت میں حاضر ہونے کے قابل تھے۔ مگر انہوں نے عدالت میں آنے سے صاف انکار کر دیا۔ ۲۶ اگست تک استغاثہ کے ۴۵۰ گواہوں پر جرح مکمل کر لی گئی۔ استغاثہ نے اپنے باقی گواہوں پر جرح ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ ۲۷ اگست کو بھی بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے عدالت میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔

ٹریبونل نے ۶۵ کریمنل پروسیجر کوڈ کے تحت علیحدہ سے ایک آرڈر منظور کیا، جس میں "ملزمان" کو ہدایت کی گئی کہ وہ دوسرے دن اپنے دفاع میں شہادتیں پیش کر سکتے ہیں۔ اس حکم نامہ کی ایک ایک کاپی تمام کامریڈوں کو دی گئی۔ ۲۸ اگست کو بھی بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے عدالت میں حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔ عدالت کی کارروائی ملتوی کر دی گئی۔ ۲۹ اگست اور ۳۰ اگست کو بھی پچھلا ڈرامہ دہرایا گیا۔ چنانچہ یکم ستمبر ۱۹۳۰ء تک کارروائی ملتوی کر دی گئی ـــــ اس تاریخ کو بھی عدالت میں کوئی شخص حاضر نہیں ہوا۔ ۵ ستمبر کو کامریڈ بیجنے کمار سنہا اور اجے کمار گھوش کی طرف سے ایک درخواست پیش کی گئی جس میں استغاثہ کے چار سو ستاون گواہوں پر دوبارہ جرح کرنے کی اجازت طلب کی گئی تھی۔ عدالت نے از سر نو گواہوں پر جرح کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد اجے کمار گھوش اور بیجنے کمار کے وکیل نے ایک ہفتے کے لئے عدالت کی کارروائی ملتوی کرنے کی درخواست پیش کرتے ہوئے وعدہ معاف گواہوں سے جرح کرنے سے انکار کر دیا۔

۱۰ ستمبر ۱۹۳۰ء تک استغاثہ کے وکیل نے اپنے دلائل مکمل کر لئے۔ اس کے ایک ماہ بعد ۷ اکتوبر کو ٹریبونل نے اپنے فیصلے میں بھگت سنگھ، شیورام راج گرو اور سکھ دیو کو پھانسی کی سزا کا حکم سنایا۔ دیش راج، اجے کمار گھوش اور جتیندر ناتھ سانیال کو رہا کر دیا گیا۔ جب کہ باقی کامریڈوں کو مختلف میعاد کی سزائیں دی گئیں۔

بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں نے پریوی کونسل کی جوڈیشل کمیٹی کے سامنے گورنر جنرل کے خصوصی اختیارات کو چیلنج کیا جن کے تحت ٹریبونل قائم کیا گیا تھا۔ لیکن پریوی کونسل نے بھگت سنگھ کے اس چیلنج کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔ "ہنگامی صورت حال میں گورنر جنرل کو ایسے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔"

برطانوی سامراج نے بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو پھانسی دے کر سمجھ لیا کہ اس نے اس شعلے کو ٹھنڈا کر دیا ہے، جو اس کے اقتدار کے ایوانوں کی جانب تیزی سے لپک رہے تھے۔ مگر وقت نے ثابت کر دیا کہ تاج برطانیہ کی یہ سب سے بڑی بھول تھی۔ اس نے انقلابی رہنما بھگت سنگھ کو ختم کر دیا۔ مگر ان کی آواز کو نہیں مٹا سکا۔ جو آخر کار برصغیر کی آزادی کی صبح نو کا پیغام بن گئی۔



فلم "ہم لوگ" متوسط طبقے کے معاشی مسائل کی داستان ہے

منظر نامہ

ضیا سرحدی

فلم کی جزویات اتنی تفصیل طلب ہیں کہ ان پر مختصر مضامین میں تسلی بخش اور بھرپور بحث اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ تاہم مختصر مضامین کی شکل میں بھی متعلقہ لوگوں کو کچھ نہ کچھ لکھنا ہی پڑتا ہے اور وہ لکھتے ہی رہتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ ایسے موضوعات پر، ان صورتوں میں مناسب روشنی پڑ بھی سکتی ہے یا نہیں۔

اب آپ منظر نامہ کے مسئلہ ہی کو دیکھ کر اندازہ لگالیں گے کہ بجائے خود یہی مضمون کس قدر وضاحت طلب ہے اور اس کو جاننے، سمجھنے اور پرکھنے کی خواہش بھی کچھ آسانی سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ منظر نامے لکھتے وقت دوسرے scenario writers کے انفرادی تجربات کیا ہوتے ہوں گے۔ لیکن جہاں تک میرے تجربوں کا تعلق ہے۔ ان تک پہنچنے کے لئے کم از کم مجھ کو تو حد درجہ دشوار اور پیچیدہ راہوں سے گذرنا پڑا ہے۔ فلم کے اس پہلو پر بھی اگرچہ اہل قلم حضرات نے بہت کچھ لکھا ہے اور میری نظر سے بھی۔ بہت سی فلموں کے طبع شدہ سینار یو "گذرے ہیں اور ان میں کچھ ایسے بھی ہیں۔ جو امریکہ کے باذوق اور نکتہ بیں منظر نگار، ایجی (Agee) اور مشہور عالم فرانسیسی متفکر "سارتر" کے تحریر کردہ ہیں مگر پھر بھی آئے دن جدید سے جدید انکشافات معرض وجود میں آتے رہتے ہیں۔ نئے نئے چراغ روشن ہوتے رہتے ہیں۔ اس لئے منظر ناموں کی ٹیکنیک بھی بدلتی رہتی ہے۔ اور یہ فن بھی نئے نئے تقاضوں سے معمور ہوتا رہتا ہے۔

بہرحال منظر نویسی، فلم کا ایک اہم شعبہ ہے۔ ایک اہم جزو ہے اور کسی فلم کی خوبی یا بُرائی کا اس پر بھی بڑا انحصار ہے۔ ویسے تو عام طور پر، یہ کام پیشہ ور قسم کے آزمودہ اور (Trained) لوگوں کے ذمہ رہتا ہے مگر بعض ہدایت کار اپنے منظر نامے خود بھی لکھ لیا کرتے ہیں۔

سوال بہرحال یہ نہیں کہ منظر نامہ کون لکھتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ منظر نامہ لکھا کیسے جاتا ہے۔ اور کیوں لکھا جاتا ہے۔ یوں تو ظاہر ہے کہ فلم کی کہانی یا افسانہ اپنے طور پر بھی، مرئیات کی ایک نہ ایک جہت ضرور مقرر کرتا

ہے۔ ہر کہانی اور ڈرامے کا، ایک طے شدہ مرئی پس منظر ہوتا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس کے باوجود منظر نویسی کی ضرورت علیحدہ طور پر کیوں ناگزیر سمجھی گئی ہے بنیادی طور پر فلم مرئی فن ہے۔ اور اس اعتبار سے فلم کی نقاب کشائی، ایک خاص مرئی ضابطہ اور گرامر کے تحت ہی، صحیح طور پر کی جا سکتی ہے۔ اس کے پیشِ نظر ہم اس مسئلہ کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱ - منظر نامہ۔ جس کو ہم ایک - Guide line کہہ سکتے ہیں۔

۲ - عکاسی۔ جو مناظر کو عملی طور سے فلم پر منتقل کرتی ہے۔

۳ - اور ہدایت کاری جو دیگر امور کے علاوہ فلم کا مرئی ربط و ضبط قائم رکھنے کے فرائض بھی انجام دیتی ہے۔

منظر نامہ جس کو ہم نے guide line کا نام دیا ہے۔ یہ طے کرتا ہے کہ فلم کو کیمرہ مین اور ہدایت کار کس طرح سے پیش کریں گے۔ یہاں پر لامحالہ فلم کی سینمائیت کا سوال سامنے آ جاتا ہے۔ اور یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ کہانی کے ماحول اور دیگر بنیادی تقاضوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کسی فلم کی سینمائی ترجمانی کس طرح سے ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ منظر نگار کے پیشِ نظر ایک اور اہم مسئلہ بھی ہوتا ہے۔ اور وہ مسئلہ فلم شو کے مقررہ وقت کا ہے زیادہ سے زیادہ فلم کے پروجیکشن کا ٹائم، ڈھائی یا دو گھنٹے کا ہوتا ہے۔ اور یہ پابندی وقت کا مسئلہ بھی خاصا اہم ہوتا ہے۔ یوں تو بعض اوقات فلموں کے لئے Short story بھی چُن لی جاتی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ طویل ناول لے لئے جاتے ہیں۔ اب دونوں صورتوں میں، منظر نگار کو، فلم شو کے مقررہ وقت کے مطابق ان کہانیوں کو فلم کے سانچے میں ڈھالنا پڑتا ہے۔ یہ کرتے ہوئے منظر نویس کو یہ خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کہ کہانی کے فکری، ادبی۔ اور دیگر تقاضے بھی پورے ہونے ہیں تو اس طرح سے فلم کی ساخت پرداخت کا ابتدائی مرحلہ منظر نویس ہی کو طے کرنا پڑتا ہے۔ ناول نویس یا دیگر غیر فلمی ادیب اور افسانہ نگار، بالعموم یہ بات کم جانتے ہیں کہ فلم کا کوئی منظر سکرین پر کتنا وقت طلب کرے گا۔ ان لوگوں کو یہ کم ہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک منٹ میں نوّے فٹ فلم کیمرہ سے گذرتی ہے اور یہ نوّے فٹ کا ہر ٹرپ ایک منٹ کا وقت کھا جاتا ہے ان تمام باتوں کے لحاظ سے منظر نگار بیک وقت فنکار ہونے کے ساتھ ساتھ - Methmetrical calculation کے فرائض بھی انجام

دیتا ہے۔ مگر تاہم اس آخر الذکر میکانکی قسم کے کام کے مقابلہ نہیں مناظر کی فنی اور فلمی تشکیل، ترتیب اور تقسیم کا کام کہیں زیادہ اہم اور تخلیقی جاں سوزی کا ہوتا ہے۔

اس مسئلہ پر روشنی ڈالنے کے لئے میں سمجھتا ہوں کہ یہاں پر اگر میں اپنے ایک تجربہ کی تصویر کشی کر دوں تو شاید زیادہ مناسب ہو۔ کچھ عرصہ ہوا میں نے بمبئی میں "ہم لوگ" کے نام سے ایک فلم بنایا تھا۔ بہ لحاظ مضمون یہ فلم جس کی کہانی خود میری ہی تحریر کردہ تھی ہندوستانی مڈل کلاس کی بدحالیوں اور اس کے معاشی مسائل کی داستان تھی۔ اور اس کے کردار انہیں بدحالیوں کے آئینہ دار تھے۔ اس لحاظ سے "ہم لوگ" کی کہانی کے ساتھ اول سے آخر تک ایک سنگین، غم زدگی اور المنا کی پیوست تھی۔ چنانچہ اس کا منظر نامہ لکھتے وقت میرے سامنے مقدم سوال یہ تھا کہ کہانی کے تخیلی اور ادبی ماحول کے لحاظ سے نہ صرف یہ کہ مناظر کی مقدار۔ طوالت یا وسعت کیا ہو۔ بلکہ یہ بھی کہ ان کی مرئیات کا تعین کیونکر اور کس طرح کا ہو۔ ادھر ہم لوگ کی کہانی چونکہ مطلقاً حقائق پر مبنی تھی۔ اسی لئے IMAGES کی تشکیل و تعبیر بھی انہیں حقائق کی مقررہ راہوں پر لازم ہو گئی تھی۔ اور منظر نامہ کے آغاز ہی سے مجھے اپنی سوجھ کی ڈگر یہی رکھنی پڑی تھی جب فلم کی OPENING یا پہلے منظر کا مسئلہ درپیش ہوا۔ تو میں کئی دن تک یہیں رکا رہا۔ میں نے بلا مبالغہ

بیسوں مختلف نوعیت اور وضع قطع کے مناظر سو[چے]
لکھے۔ ان کو جانچا، پرکھا۔ مگر بار بار میں اسی نتیجہ پر پ[ہنچا]
کہ نامناسب اور بے جوڑ ہیں۔

یوں تو کہانی کا آغاز تھا کہ ایک منشی جی، ا[...]
دن بھر کی معاشی جدوجہد اور ملازمت کی عرق ریزی ک[ے]
بعد شام کے وقت گھر لوٹتے ہیں۔ اب اگر میں سیدھے سی[...]
یہی فلما لیتا کہ منشی جی محلے سے گذر کے اپنے گھر داخل ہو گ[ئے]
تو کہانی کی ضرورت کے لحاظ سے یہی کافی تھا۔ مگر سوال اس
وقت منشی جی کی جسمانی نقل و حرکت کا نہیں تھا۔ اس ل[ئے]
کہ ہم لوگ کی کہانی، کا فوکس بنیادی طور پر، کیریکٹرز کے
ذہنی ردعمل پر تھا۔ ان کے فکر اور ان کی سوچ کے انداز پ[ر]
تھا۔ لہٰذا میں یہ سوچنے لگا تھا کہ کنہیا لال کے ذہن کو ا[...]
کی سوچ کو۔ اس کے غموں کو اور اس بناوٹ کے انسا[...]
کو مکمل طور پر پہلے ہی منظر میں کیوں نہ لوگوں سے روشناس
کرا دوں۔ میں، تعویق سے کام کیوں لوں۔ چنانچ[ہ]
بے شمار کاوشوں کے بعد میں نے پہلا منظر محلے کے، نیم تار[یک]
نیم روشن، اور جلتے بجھتے چراغ شروع کیا میرے نزدیک یہ چراغ
اس طبقہ کی زندگی کے مماثل تھا۔ جو اس فلم کا مرکزِ خیال تھ[ا]
مجھے اس طبقہ کی جلتی بجھتی زندگی کا ایک "سمبل" چاہیئے تھ[ا]
وہ اس چراغ میں مجھے مل گیا اور اسی سے میں نے مطمئن
ہو کر اپنی فلم کا آغاز کر دیا آگے چل کر بھی یہی ہوتا رہا۔ مگر آخر

باقی صفحہ ۵۸ پر ملاحظہ فرمائیں



بھارت کی مقبول اداکارہ نوتن شوٹنگ میں حصہ لینے سے قبل میک اپ کر رہی ہیں



پیپلز پارٹی میں جماعت اسلامی کے نمائندے — کوثر نیازی

صدرِ بھٹو کو بائیں بازو کی

: الفتح رپورٹ :

مرکزی وزیرِ اطلاعات مولانا کوثر نیازی نے اپنی مختصر مدّتِ وزارت کے دوران صحافت اور ابلاغ عامہ کے اداروں میں جو اُدھم چوکڑی مچائی ہے۔ اس کی مثال پاکستان کی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ صحافیوں کے مسائل کو دیدہ و دانستہ نظر انداز کرنا، کبھی مالکان اخبارات کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے باقی ماندہ معدودے چند شیر علی کے دَور کے نکالے ہوئے صحافیوں کو ملازمت پر بحال کرنے سے انکار کرنا اور کبھی ان سے اتنا ناراض ہونا کہ ذرا سی بات پر ان کا نیوز پرنٹ کا کوٹہ بند کر دینا، کبھی "نوائے وقت"، جیسے عوام دشمن پالیسی کے علمبردار اخبار کی شر انگیزیوں سے اغماض کہ اس کے مدیر و مالک سے ایوب خان اور کالاباغ کے زمانے سے دیرینہ تعلقات ہیں اور کبھی یہ نادر شاہی طعیش وطنطنہ کہ "سن" جیسے ضعیف العقیدہ وضعیف الجثہ اخبار پر اشاعت وطباعت کے دروازے بند کر دینا اور اسے اس وقت تک بحال نہ کرنا جب تک پی ایف یو جے کے سیکرٹری جنرل تادمِ مرگ بھوک ہڑتال کی دھمکی نہ دیں یا اس کے مالک و مدیر اپنے کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک نہ کرلیں۔

پی ایف یو جے کے ساتھ تو خیر انہیں ازلی بُغض وعناد ہے —— اور کیوں نہ ہو، موصوف نظری اور عملی دونوں اعتبار سے جماعتِ اسلامی کے تربیت یافتہ ہیں۔ پچھلے دنوں پی ایف یو جے کے رہنماؤں نے اور اس کے بعد متعدد ملحقہ یونینوں نے وزارتِ اطلاعات و نشریات کی بدعنوانیوں کا جو پردہ چاک کیا تو مولانا موصوف بلبلا اٹھے۔ دوڑے دوڑے لاہور پہنچے کہ پنجاب یونین کی صفوں میں کچھ انتشار برپا کیا جائے لیکن لاہور کے صحافیوں کی بھاری اکثریت یونین کی وفادار اور عوام دوست ہے۔ وہاں بے شمار صحافی اور پریس ورکرز ۱۹۷۰ء کی ریشہ دوانیوں کی چوٹ کھائے ہوئے ہیں۔ وہ ان کے دھوکے میں کیوں کر آتے بہت زور مارا تو سولہ عدد صحافی اور نیم صحافی ان کی گرفت میں آئے اور یہ ساری کارکردگی ان کی اور ان کے نوگرفتارِ وفا شیخ حامد محمود چیئرمین نیشنل پریس ٹرسٹ کی سر توڑ کوششوں کا نتیجہ تھی۔

ان سولہ ارکان میں بھی تین این یو جے کے ارکان تھے جو اپنی صحافی دشمنی، مزدور دشمنی اور رجعتیہ سیاست کے لیے مشہور ہیں۔ پی یو جے کی مجلسِ عاملہ نے ان سب کے بخیے ادھیڑ دیئے۔ مجلسِ عاملہ کی ایک قراردادمیں بتایا گیا کہ ان میں سے چار تو پی یو جے کے ممبر ہی نہیں۔ تین این یو جے کے ارکان ہیں، دو نے اس بیان سے لاتعلقی کا اظہار کر دیا اور باقی حضرات وہ تھے جو چڑھتے سورج کی پرستش کرتے ہیں اور تنخواہیں اور عہدے بڑھوانے اور غیر ملکی دوروں کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بزرگ "لبرل" صحافی جو وقتاً فوقتاً سیاسی قلابازیاں کھاتے رہتے ہیں مذکورہ معجون مرکب بیان کے روحِ رواں تھے لیکن انہوں نے بوجوہ بیان پر دستخط نہیں کیے۔ یہ حضرات کہنے کو تو آزادیٔ صحافت کے پرجوش حامی اور نیشنل پریس ٹرسٹ کے کٹّر دشمن ہیں مگر اِن دنوں جب سے حامد محمود نے ٹرسٹ کی چیئرمینی سنبھالی ہے اپنے تمام اصول فراموش کر بیٹھے ہیں اور آج کل ان کی ستائش میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے رہتے ہیں۔ اور بیٹھے بیٹھے "حامد محمود زندہ باد" کے نعرے لگاتے رہتے ہیں دیکھیں اس محنتِ شاقہ کا انہیں کیا صلہ ملتا ہے۔

چلیے، یہ سب کچھ تو ہوتا رہتا ہے۔ پی ایف یو جے نے اپنی ۲۲ سالہ زندگی میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ الطاف حسین سے لے کر اے کے سومار، معظم علی، ایس اے رحمان، شیخ آفتاب اور شیر علی کے دَور دیکھے ہیں اور ان سب کی صحافت دشمنی اور عوام دشمنی کو بے نقاب کیا ہے۔ پی ایف یو جے ہر امتحان میں پوری اتری ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مولانا کوثر نیازی اور حامد محمود کے دَور میں صحافیوں اور دوسرے پریس ورکروں کو کن آزمائشوں سے گزرنا ہے۔

وزیرِ اطلاعات دراصل جو کھیل صحافت کے میدان میں کھیل رہے ہیں وہی سیاست کے میدان میں بھی کھیل رہے ہیں۔ باالفاظِ دیگر ابلاغِ عامہ کے ذرائع کو جن میں اخبارات بھی شامل ہیں وہ جس طرح استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ان کی سیاسی حکمت عملی کا ایک حصہ ہے۔

مولانا بنیادی طور پر دائیں بازو کی رجعت پسند سیاست کے ہمیشہ علمبردار رہے ہیں۔ ان کی ایک عرصہ تک جماعتِ اسلامی سے وابستگی اس کا بیّن ثبوت ہے۔ وہ پیپلز پارٹی میں الیکشن سے صرف چار یا پانچ ماہ پہلے شامل ہوئے۔ اور اپنے رسالے "شہاب" کے ذریعہ جو مغلظاتی صحافت میں اپنی مثال آپ رہا ہے، جماعتِ اسلامی کی مخالفت اور بھٹو صاحب کی حمایت کے زینے پر چڑھ کر پیپلز پارٹی سے روشناس ہوئے اور بتدریج وزارت کے عہدے —— تک پہنچے !

اب ان کا بنیادی منصوبہ یہ ہے کہ پیپلز پارٹی سے بائیں بازو کے تمام عناصر کو کمیونسٹ قرار دے کر نکال باہر کیا جائے۔ اس کے لیے انہوں نے ایک فلسفہ بھی تیار کر لیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک "پیپلز پارٹی کے سب سے بڑے دشمن بائیں اور دائیں بازو کے انتہا پسند ہیں!" دراصل اس نام نہاد سیاسی نعرے کا بنیادی مقصد پیپلز پارٹی کے بائیں بازو کے عناصر پر حملہ کرنا اور مسٹر بھٹو کو ان کی حمایت سے محروم کر دینا ہے تاکہ بھٹو اور ان کی پارٹی تمام تر دائیں بازو کی جماعتوں بالخصوص جماعتِ اسلامی پر انحصار کرنے پر مجبور ہو جائے۔

ذکر مولانا کوثر نیازی کی رُجعت پسندی، بھارت اور رُوس نوازی کا

حمایت سے محرُوم کرنیکی سازش

یہی وجہ ہے کہ انہوں نے روٹری کلب کے پلیٹ فارم سے کمیونسٹوں اور کمیونزم پر حملہ کیا ہے۔ لیکن مولانا مودودی نے یہ کہہ کر جلد ہی مولانا کی پول کھول دی کہ "مسٹر بھٹو نے کمیونزم کے خلاف جہاد میں جماعتِ اسلامی کا تعاون حاصل کرنے کی درخواست کی ہے اور یہ کہ جماعتِ اسلامی اس نیک کام میں ان سے تعاون کرنے کے لیے تیار ہے۔"

مولانا اور دائیں بازو کے عناصر اور رجعتیوں کی یہ کوشش ہے کہ نیشنل عوامی پارٹی سے پیپلز پارٹی کے بڑھتے ہوئے تضاد سے فائدہ اٹھا کر مسٹر بھٹو کو تمام تر دائیں بازو کی جماعتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔

اس ضمن میں سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا خود کو روس اور بھارت کی حکمتِ عملی کا دشمن قرار دیتے ہیں حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے کیونکہ نیشنل پریس ٹرسٹ میں شیخ حامد محمود کی چیئرمین کی حیثیت سے تقرری کی سب سے بڑی وجہ حامد محمود کا وہ مضمون ہے جو انہوں نے شملہ کانفرنس کے انعقاد سے دو روز پہلے پاکستان ٹائمز میں (SUMINIT PRIORITIES) کے عنوان سے لکھا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس مضمون کے عوض مولانا کوثر نیازی نے انہیں ٹرسٹ کا چیئرمین مقرر کیا تاکہ وہ ٹرسٹ کے بارہ اخبارات و رسائل میں اس سیاسی حکمت عملی کو فروغ دے سکیں اور رائے عامہ کو اس کا ہمنوا بنا سکیں۔

اس مضمون میں کیا کچھ نہیں کہا گیا۔ جس نے پڑھا وہ دنگ رہ گیا کہ یہ مضمون اور "پاکستان ٹائمز" میں شائع ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کی ۲۵ سالہ تاریخ میں اس مضمون سے زیادہ روسی سوشل امپیریلزم اور بھارتی توسیع پسندی کی کسی نے بھی پُر زور وکالت نہیں کی۔ اس مضمون میں بھٹو صاحب سے کہا گیا تھا کہ وہ شملہ پہنچتے ہی "بنگلہ دیش" کو واقعاتی طور پر (DEFACTO) اور اس کے بعد قانونی طور پر (DEJURE) تسلیم کر لیں۔ اس مضمون میں کہا گیا تھا کہ کشمیر کو تقسیم کر دیا جائے۔ یعنی جموں و لداخ بھارت کے حوالے کر دیا جائے اور آزاد کشمیر پاکستان کے حوالے اور وادی کو آزاد کر دیا جائے۔ اور پھر بھارت پاکستان اور کشمیر کا کنفیڈریشن قائم کیا جائے۔ پاکستان بھارت سے بیس سال کا جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کرے اور بعد ازاں دونوں ملکوں کی فوجوں میں تخفیف کر دی جائے۔ اس مضمون کا سب سے شر انگیز نکتہ وہ تھا جس میں اسرائیل کی صیہونی سیاست کو عوامی جمہوریہ چین کے مماثل قرار دیا گیا تھا اور عربوں کو اس امر کے لیے احمق گردانا گیا تھا کہ انہوں نے اب تک اسرائیل کو تسلیم کیوں نہیں کیا۔ اب کوئی پوچھے کہ حضرت مولانا کوثر نیازی، کیا اس سے زیادہ روس نوازی اور بھارت نوازی کا تصور ممکن ہے؟

مولانا مغلظاتی صحافت کے بانی ہیں

مسٹر بھٹو کی ہندوستان سے تعلقات کو معمول پر لانے، سرحدوں سے فوجوں کی واپسی اور جنگی قیدیوں کی رہائی کی کوششوں کو اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کرنا اور نئے حالات کے نام پر بھارتی توسیع پسندوں اور سوشل سامراجیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنا اور ملک کی آزادی اور اقتدارِ اعلیٰ کا سودا کرنا: یہ ہے مولانا کوثر نیازی اور ان کے مقرر کردہ مسٹر حامد محمود کی حکمت عملی، جس کا وہ پرچار کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کاروبار کو جاری رکھنے کے لیے کمیونزم کا ہوّا کھڑا کرنا ضروری ہے تاکہ بائیں بازو کی طاقتوں کو کمزور کیا جا سکے۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگراموں کا بھی جو حشر مولانا کی وزارت کے زمانے میں ہوا ہے وہ بھی سب پر واضح ہو چکا ہے۔ مولانا نے آتے ہی یہ اعلان فرمایا کہ سرمایہ دار ٹھیک کہتے ہیں کہ ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں سے طبقاتی منافرت پھیلتی ہے۔ انہوں نے ہدایت کی کہ طبقاتی منافرت پھیلانے کا سلسلہ بند کیا جائے۔ حالانکہ ابھی پچھلے ہی دنوں مسٹر بھٹو کو کراچی کے ایوانِ صنعت تجارت کی ضیافت میں تقریر کرتے ہوئے یہ کہنا پڑا کہ جب تک ملک میں طبقات موجود ہیں اور طبقاتی استحصال جاری ہے طبقاتی منافرت بھی باقی رہے گی۔ دراصل مولانا طبقاتی منافرت کو ختم کرنے کے پسِ پردہ سرمایہ داری کی حمایت اور مزدور طبقہ کی تحریک کی مخالفت کرنا چاہتے ہیں۔ استحصالی طبقوں سے نفرت کے بغیر طبقاتی جدوجہد اور سوشلزم کے قیام کی جدوجہد ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ داروں کی طرح مولانا بھی طبقاتی منافرت سے خائف ہیں۔ ٹی وی اور ریڈیو کے پروگرام ایوب اور یحییٰ کے دورِ کے پروگراموں سے کسی طرح بھی مختلف نہیں۔ وہی نظریۂ پاکستان کے نام پر رجعت پسندی، کٹھ ملائیت، جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظریات کے پرچار کا سلسلہ از سرِ نو شروع ہو گیا ہے۔

صحافت کے میدان میں آزاد خیال اور محبِ وطن صحافیوں کی مجوزہ تطہیر کا پروگرام دراصل اس مجموعی رجعت پسندانہ سیاسی منصوبے کا ایک حصہ ہے۔ رجعت پسند خواہ وہ پیپلز پارٹی کے اندر ہوں یا اس کے باہر، خوب سمجھتے ہیں کہ صحافت اور ثقافت اور تعلیم کے شعبوں میں رجعت پسندی کی زمین ہموار کیے بغیر ان کے بائیں بازو پر حملے کے منصوبے کامیاب نہیں ہو سکتے۔

ملک کے تمام محبِ وطن عوام، کسانوں، مزدوروں طالب علموں، صحافیوں اور دانشوروں کا فرض ہے کہ وہ متحد ہو کر اندرونی اور بیرونی رجعت پسندوں کی گھناونی سازش کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ پاکستان کے میکار بخقیوں کے چہرے بے نقاب کریں اور امریکی سامراج روسی سوشل سامراج، بھارتی توسیع پسندوں اور پاکستان میں ان کے ایجنٹوں کے خلاف متحدہ محاذ قائم کریں۔ اس جہاد میں سب سے بڑا فرض پیپلز پارٹی کے بائیں بازو کے عناصر اور خود مسٹر بھٹو پر عائد ہوتا ہے ابھی وقت ہے کہ وہ متنبہ ہوں اور حب الوطنی اور عوام دوستی کے تقاضوں کو پورا کریں۔ ایسا نہ ہو کہ تاریخ میں ان کا نام ناعاقبت اندیشوں کی فہرست میں درج کر دیا جائے۔

اقلیتی فرقوں کے مسائل دُور کئے جائیں گے : صفحہ ۱۲ سے آگے

دیوان ـــــ چار پانچ لاکھ ایکڑ جو اور ہے وہ کس صورت میں ہے۔

گورنر ـــــ وہ غیر آباد سرکاری زمین پڑی ہے پہلے نیلام ہوتی تھی اب نیلام بند کردیا گیا ہے۔ تاکہ عام آدمی تک اور خاص طور پر اس شخص کو جو بنیادی طور پر کسان ہو اس کو یہ زمین مِل سکے۔

دیوان ـــــ ایک اور مسئلہ بھی ہے جو ہمارے ہاں بھی ہے شاید آپ کے ہاں بھی ہو، چھوٹی زمین اگر کاشت کاروں کو دے بھی دی جاتے۔ اِن کے پاس ابھی جدید کاشت کے ذرائع نہیں ہیں۔ اس پر آپ کیا کوآپریٹو تنظیم کی صورت میں سوچ رہے ہیں۔؟

گورنر ـــــ میرے خیال میں آگے چل کر یہی کرنا پڑے گا۔ کہ ان کو کوآپریٹو کی بنیاد پر امداد دی جاتے۔ کوشش یہی کی جائے گی کہ ان کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کی جائیں ۔ ہمارے ہاں یہ مسئلہ بھی ہے کہ چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں۔ خاص طور پر سندھ میں کہیں کسی کا دو گھروں کا گاؤں ہے اور وہ اِس کا رئیس ہے۔ ہم یہ نہیں چاہتے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ بڑے بڑے گاؤں بنیں۔ جن کو ان کے حقوق دیئے جائیں ـــ ایسی تو دنیا میں کوئی حکومت نہیں جو دو دو گھروں والے گاؤں کو سہولتیں مہیا کرے۔ دنیا میں دولت مند حکومتیں بھی ایسا نہیں کرسکتیں۔

ہمارا ارادہ ہے کہ بڑے بڑے گاؤں بنائے جائیں تاکہ آسانی ہو سکے اور کسانوں کو موجودہ دور کی سہولتیں فراہم کردی جائیں۔ مثلاً بجلی ہے ڈاک خانے ہیں اور دوسری اس قسم کی سہولتیں ہیں۔ میرے خیال میں یہ پہلا دور ہے جس میں ان باتوں پر غور کیا جا رہا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اجتماعی طور پر لوگوں کی بھلائی کے لئے سوچا جائے۔ انفرادی طور پر تو لوگوں نے بہت سوچا اور انفرادی طور پر مالدار ہو گئے۔ اب ہمارے ہاں ہر چیز میں اجتماعیت کو اولیّت حاصل ہے اور اس کے اجتماعی نتائج بھی برآمد ہوں گے۔

دیوان ـــــ میر صاحب! اب آپ کی پارٹی کو سندھ میں عوام نے منتخب کیا ہے اس پارٹی کی زرعی اصلاحات اور دوسری اصلاحات پر عمل درآمد کرانے میں آپ کی پارٹی کا ڈھانچہ معاون اور مددگار ہو سکے گا۔؟

گورنر ـــــ وہ تو بہت بڑا معاون ہے۔ آج تک وہی معاونت کرتے آئے ہیں۔ ابتدائی طور پر نئے لوگ ہیں۔ بات سمجھنے اور عمل کرنے میں ان لوگوں کو مختصر سے عرصے میں جتنی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ یہ مثال کہیں نہیں ملے گی۔ اتنے مختصر سے عرصے میں یہی دو تین سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ الیکشن میں اتنی بڑی اکثریت میں آجائیں گے۔ بہت بڑی جد و جہد کے بعد تو آدمی یہ مقام حاصل کر سکتا ہے۔ یہ تو بھٹو صاحب کی قیادت تھی، محنت تھی، بڑی مشقت کی تھی۔ دن رات کام کیا تھا۔ ان کے ساتھ جو نیاز مند تھے وہ بھی بڑی شدت کے ساتھ چلتے رہے۔ ایک دن میں بیس بیس جلسے کر جانا، تیس تیس جلسے کر جانا، مختلف مقامات پر لڑنا۔ اندازہ کریں کہ زور و شور سے کام کرنے کا جو نتیجہ نکلا۔ آپ جانتے ہیں کہ نئی بات ہو، اتنی زوردار آمریت کہ لوگ گھبراتے تھے۔ اجتناب کرتے تھے۔ تھوڑے سے لوگ پرانے لوگوں میں سے آئے۔ عموماً زیادہ تر نئے لوگ آئے تھے۔ نئے لوگوں کو آگے لے جانے کے لئے بھی تھوڑا سا وقفہ چاہیئے۔ غلطیاں بھی ہوں گی۔ اچھائیاں بھی ہوں گی۔ برائیاں بھی ہوں گی۔ پھر بھی قیادت سے نئے لوگوں کو رہنمائی مل جاتی ہے۔

دیوان ـــــ ایک چیز اور ہے آپ کا کرم ہے کہ آپ اتنی صفائی سے بات کر رہے ہیں۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ سندھ میں پیپلز پارٹی کا جماعتی کردار ایسا نہیں ہے جیسا پنجاب میں ہے۔ پنجاب میں مڈل کلاس زیادہ ہے۔ یہاں زیادہ تر زمیندار ہیں۔

گورنر ـــــ میں آپ سے عرض کروں یہاں زیادہ تر جماعت پر غالب اکثریت تو لوئر کلاس ہی کی ہے۔ صوبائی اور قومی اسمبلی کے ممبر ہیں۔ طریق کار ایسا ہے الیکشن کا جس میں ضرورت ہوتی ہے پیسے کی۔ عام آدمی پیسے خرچ نہیں کر سکتا۔ باقی جتنے عہدے ہیں ان پر زیادہ تر غریب لوگ ہیں۔ بڑا آدمی ان پر غالب نہیں ہوا۔ یہ تو صلاحیتوں پر ہوتی ہے۔ قیادت نہ امیری پر ہوتی ہے نہ غربت اور تنگ دستی پر۔ قیادت تو صلاحیت پر ہوتی ہے۔ کتنی صلاحیت ہے۔ کتنا تجربہ ہے۔ وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر کتنا آگے بڑھ سکتا ہے۔ حالانکہ مشکلات ہیں۔ نئی نئی پارٹی ہے۔ سندھ میں پارلیمانی پارٹی ہو یا مرکز میں ہمارے نمائندوں کا کردار اچھا ہے۔ ویسے کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اس میں پریذیڈنٹ سے محبّت کو خاصا دخل ہے۔ جذباتی عقیدت ہے۔ وہ سمجھتے ہیں بھٹو صاحب یقیناً غریبوں کے لئے اچھا کام کریں گے اور بھٹو صاحب کے سامنے سب تکالیف ہیں۔ ہر گاؤں میں ہر خطے میں جو مشکلات ہیں ان سے بھٹو صاحب واقف ہیں۔ اِس لئے ہر جگہ "جیئے بھٹو" کا نعرہ ملتا ہے۔

دیوان ـــــ میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ صدر صاحب آنے والے ہیں۔ آپ وہاں تشریف لے جائیں۔ کوئی پیغام اگر آپ ہندوستان کے لوگوں کے لئے اگر آپ دینا چاہیں۔

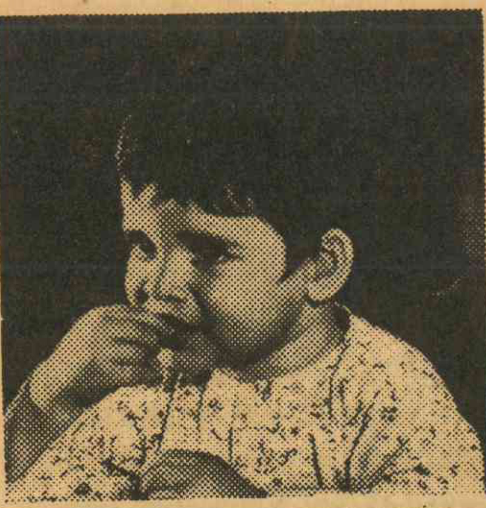
گورنر ـــــ ہمارا پیغام یہی ہے کہ میرے خیال میں ہم نے جتنا بھی عرصہ گزارا ہے ہمارے برّصغیر میں جذبات سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ ہوش سے حالات کا جائزہ نہیں لیا گیا میں درخواست کروں گا کہ ہوش اور حواس سے حالات کا جائزہ لیا جائے۔ اور جینے کی دونوں ملکوں میں گنجائش ہے کہ ہم آسانی سے جی سکتے ہیں۔ بنیادیں وہ ہونی چاہئیں جو تسلیم شدہ اصول ہیں۔ آسانی کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ باہمی عزت و احترام سے رہ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں جو بھی مسائل ہیں ان کا حل بنیادی تسلیم شدہ اصولوں کے تحت ہو تو زیادہ مناسب ہے۔ ہم پہلے جھگڑا کرتے آئے ہیں۔ اس سے کیا فائدہ ہوا۔ اس سے بہتر ہے اور نئے طریقے اپنائے جائیں۔ آج تک جو طریق کار رہا ہے اس سے دونوں ملکوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہے ـــــ اس درمیان میں دو تین جنگیں بھی ہو چکی ہیں جو بنیادی طور پر دنیا میں کہیں بھی پسند نہیں کی جاتی ہیں۔ محبّت کو ہر طبقہ پسند کرتا ہے وہاں بھی یہاں بھی ہوش و حواس سے کام نہیں لیا گیا۔ جذبات کو درمیان میں رکھا گیا۔

میں تو یہی درخواست کروں گا کہ نفرت کو درمیان سے ہٹا دیا جائے۔ زیادہ درست اور اچھا ہو گا۔ پھر دونوں ملک ترقی بھی کر سکتے ہیں۔ دونوں ملکوں کے عوام بڑے محنتی ہیں۔ جفاکش ہیں۔ تھوڑی سی چیز پر راضی ہو جانے والی مخلوق بھی ہے۔ زیادہ مراعات بھی نہیں مانگتے۔ دُکھی سُکھی حالت میں بھی وہ ملک کے لئے بہت نمایاں کردار ادا کر سکتے ہیں۔ درمیان سے اگر نفرت کا نام نکل جائے تو میں سمجھتا ہوں دونوں ملک بہت آگے بڑھ سکتے ہیں۔ بہت ترقی کر سکتے ہیں بہت سے وسائل ہیں۔ اس ایک چیز کو نکال دیا جائے۔ دلوں میں ایک گنجائش پیدا کی جائے۔ انسانیت کو درمیان میں رکھا جائے۔ دنیا اتنی چھوٹی ہو گئی ہے کہ اِس میں اِس جنون سے کام نہیں چل سکتا۔

"میرا پیغام محبّت کا پیغام ہے۔"

دیوان ـــ بہت بہت شکریہ۔ اگر کسی بھی معمولی صحافی کی آواز میں کوئی بھی طاقت ہے تو میں تو یہی دعا کروں گا۔ آپ جس مقصد کو لے کر اٹھے ہیں کامیاب ہوں۔







اب بھی توانا کل بھی توانا

یہ ہنسی، یہ مسکراہٹ، کیسی دلکش، کتنی معصوم۔
یہ اظہار، یہ انداز، کیسا پیارا، کتنا پُر اعتماد۔
یہ سب تندرستی اور توانائی کی بدولت ہے۔ یہ تندرستی، یہ توانائی صرف زود ہضم تلو ہی سے ملتی ہے۔ اور ہر ماں یہ بھید جانتی ہے۔ اسی سبب وہ ہر روز تین بار بہت لگن سے زود ہضم تلو میں لذیذ اور توانائی بخش کھانا پکاتی ہے۔ اسی لئے تلو اور تندرستی، تلو اور توانائی سترہ سال سے ہر گھر میں، گھر گھر میں ساتھ ساتھ ہیں۔ آپ بھی ہمیشہ زود ہضم تلو میں پکائیے۔

□ توانائی کے کیلوریز اور وٹامن اے اور ڈی سے بھرپور □ خالص، خوشبودار خوش ذائقہ □ معدہ میں جمتا نہیں □ معدہ پر بوجھ نہیں بنتا۔



زود ہضم تلو کی بدولت آج بھی شاد کل بھی شاداں

PRESTIGE T.B. 9/1_-4/71

بقیہ :- ویت نام میں امریکی جرائم

جب امریکی اخباری نمائندے وہائٹ ہاؤس سے معلومات حاصل کرنے پہنچے تو ۲۹ اور ۳۰ جون یعنی دو روز تک امریکی حکام اس بمباری کی تردید کرتے رہے اور کہا: "ہم نے ان اطلاعات پر غور کیا ہے مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ امریکی جہازوں نے ڈیموں اور پشتوں پر بمباری نہیں کی ہے"۔ مگر انہی دنوں میں امریکی حکام کی اس تمدید کی تردید ہوئی اور ہنوئی میں سویڈن کے سفیر نے اعلان کیا کہ "میں نے اپنی آنکھوں سے امریکی ہوائی جہازوں کو دریائے سُرخ کے ڈیلٹا میں پشتوں پر بمباری کرکے انہیں تباہ کرتے دیکھا ہے۔" دوسرے روز نیویارک ٹائمز نے ایک فرانسیسی اخباری نمائندے بور دال کا ایک بیان چھاپا۔ جس نے ویت نامی اور دیگر غیر ملکی صحافیوں کے ساتھ ہنوئی سے چالیس میل دور واقع پھولی قصبے کا دورہ کیا تھا اور امریکی جہازوں کے تین حملوں کے نتیجے میں تباہ ہونے والے پشتوں اور ڈیموں کا معائنہ کیا تھا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ "ہم نے وہاں پر اِدھر اُدھر بہت سے شگاف دیکھے جنہیں عورتیں بڑے استقلال کے ساتھ مٹی سے بھر رہی تھیں۔ اس بند کے قریب واقع تمام مکانات بمباری سے تباہ ہو چکے تھے۔ بند کے گیٹ ٹوٹ چکے تھے اور دھانچے کنکریٹ کی بلیاں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں۔ اور بعض دراڑیں تو ایک ایک فٹ چوڑی تھیں۔ بند کے آس پاس کے تمام درخت یا تو گر چکے تھے، یا انہیں نقصان پہنچا تھا۔"

لیکن امریکی حکام مجرموں کی طرح خاموش اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ بمباری سے کمزور پڑنے والے یہ بند اگست کی طغیانی کا دباؤ برداشت نہیں کر پائیں گے اور زیریں علاقے سیلاب میں بہہ جائیں گے۔

ابھی چند روز قبل فرانسیسی اخبار "لی ماندے" میں ایک فرانسیسی جغرافیہ دان یوس لاکوستے نے لکھا کہ اس بات کا شدت سے اعلان کر دینا چاہیئے کہ اگر اس سال گرمیوں میں یہ بند ٹوٹ جائیں تو اس کی تمام تر ذمہ داری امریکہ پر عاید ہوگی۔ اسی طرح دنیا بھر میں امریکی سامراج کے ان غیر انسانی اقدامات کی پُرزور مذمت کی جا رہی ہے۔

امریکی سامراج کی بمباری اور سرنگیں ویت نامی عوام کو جد و جہد آزادی سے نہیں روک سکتیں۔ امریکی سامراج کو اپنے جرائم کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ صرف گزشتہ تین ماہ میں دو سو ساٹھ امریکی جہاز مار گرائے گئے ہیں جن میں اٹھ بی - ۵۲ بمبار بھی شامل ہیں اور پچاس امریکی تباہ کن اور بحری جہازوں کو نقصان پہنچایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ جنوبی ویت نام کے حریت پسند کٹھ پتلی حکومت کی فوجوں کو مسلسل پیچھے دھکیل رہے ہیں۔ اور امریکی سامراج کی "ویت نامیانے" کی ظالمانہ پالیسی مسلسل ناکام ہو رہی ہے اور دنیا بھر کے امن پسند اور آزادی پسند عوام یک زبان ہو کر امریکی سامراج کی مذمت کر رہے ہیں اور اُسے ویت نام سے نکل جانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

بقیہ :- الفتح انکشاف

ظاہر کردہ زرِ مبادلہ حکومت کی بتائی ہوئی مالیت سے کم ہوا تو فیڈریشن اس کمی کو پورا کر دے گی۔ حکومت نے یہ تجاویز تسلیم کر لیں۔ تینوں اسیر سرمایہ داروں کو رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد سرمایہ داروں نے چار کروڑ روپے کی مالیت کا زرِ مبادلہ ظاہر کیا۔ جب کہ "نیوز ویک" نے غیر ممالک میں جمع زرِ مبادلہ کی مالیت ۵۰ کروڑ ڈالر بتائی تھی۔ سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کا ظاہر کردہ زرِ مبادلہ حکومت سے طے شدہ مالیت سے بہت کم تھا۔ حکومت نے اِس کمی کو پورا کرنے کا مطالبہ کیا لیکن صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کی اس فیڈریشن نے صاف انکار کر دیا بلکہ حکومت پر زور دیا گیا کہ پہلے صنعتی امن اور معاشی استحکام بحال کرو اس کے بعد ہم اپنے معاہدے کو پورا کرنے پر غور کریں گے۔ اِس فیڈریشن نے حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لئے آل پاکستان ٹیکسٹائل ملز ایسوسی ایشن سے سرمایہ داروں کے اخبارات میں بڑے بڑے اشتہارات شائع کروائے۔ جس میں کہا گیا کہ مزدور کام نہیں کرتے، پیداوار پوری نہیں ہونے دیتے اور حکومت اِس سلسلے میں کوئی کارروائی نہیں کر رہی ہے۔ اِس طرح سے عوام میں یہ تاثر دیا گیا کہ حکومت کو معاشی اور اقتصادی استحکام سے کوئی دل چسپی نہیں، اُسے محض اپنی کرسی سے غرض ہے۔

زیب تن ٹیکسٹائل ملز کے سلسلے میں فیڈریشن نے کچھ زیادہ ہی سرگرمی دکھائی۔ فیڈریشن کے ایڈمنسٹریٹر نے تمام وزراء سے ملاقات کی۔ زیب تن ٹیکسٹائل ملز کے مالکان کی ترجمانی کی۔ اور اِس طرح اپنی مزدور دشمنی کا ثبوت مہیا کر دیا۔

صنعت اور تجارت کو صحت مندانہ خطوط پر چلانے کے لئے حکومت کو چاہیئے کہ وہ فوراً فیڈریشن کا آئین بحال کر دے اور اپنی نگرانی میں فیڈریشن کے انتخابات کروائے۔

بقیہ :- منظر نامہ

میں بھی محنت کش تھا۔ میں نے اپنی محنت جاری رکھی۔ ایک سہولت مجھے اس فلم میں یہ ضرور میسر تھی کہ میں خود ہی اس فلم کا ہدایت کار تھا اور مجھے پوری طرح سے یہ اختیار حاصل تھا کہ SHOTS کی تقسیم اور ترتیب کا کام بھی خود انجام دے دوں لہٰذا میں منظر نامہ کو زیادہ مرئی تفصیلات اور ہدایت کارانہ TREATMENT کے ساتھ لکھ رہا تھا۔ اس سبب سے کیریکٹرز کے تعارفی SHOTS یعنی ان کی پہلی رونمائی کا مسئلہ بھی مجھی کو طے کرنا تھا۔ میرے نزدیک کیریکٹرز کا اولیں منظر یا شاٹ ہمیشہ سے بہت اہم رہا ہے۔ یہ ایک طرح کا پیش لفظ ہوتا ہے جو ناظرین کے لیے کردار کے رجحانات، افتادِ طبع اور ان کی حیات کے خارجی تاثرات کی آئینہ داری کرتا ہے اور دیکھنے والوں کو کردار کی شناخت میں شروع ہی سے مدد دیتا ہے۔ اسی لیے میں نے ممتن کے تعارف میں ایک ایسا زاویہ اور اس کا خاص حجم تجویز کیا تھا۔ جس میں اس کی مدقوق کھانسی کو پوری وضاحت کے ساتھ ابھارنا منظور تھا۔ ادھر بلراج کے تعارف کا سوال جب پیدا ہوا تو پھر مجھے یہی سوچنا پڑا کہ یہ انسان جس کے نحیف دل سے غمِ دوراں، غمِ عشق اور دوسرے لاتعداد غم پیوست ہیں اور جن کی وجہ سے وہ زندگی کو ایک بوجھ سمجھتا ہے۔ پہلے ہی شاٹ میں کیوں کر فلم بند ہوگا۔ اب میں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ اس بوجھ کو میں کس طرح سے رونما کروں۔ بوجھ کا واسطہ چونکہ عام لحاظ سے آدمی کے پیروں سے ہوتا ہے۔ جسم کا سارا بوجھ اور پھر اس جسم کے تمام آلام کا بوجھ بھی انہی کو اٹھانا پڑتا ہے۔ لہٰذا میں نے کیمرہ کو بلراج کے پیروں پر مرکوز کر دیا اور یہ بتایا کہ اس کے بدحال افلاس زدہ اور نحیف پاؤں۔ زندگی کے غم اور الم انگیز سفر میں کس مشکل سے اُٹھ رہے ہیں۔ مجھے پوری طرح یاد نہیں مگر میرا خیال ہے کہ عظیم غالب کا یہ شعر، اس وقت میرے ذہن میں ایک چراغ ضرور جلا رہا تھا

ہوتے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی
نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

بہرحال ہم لوگ کے منظر نامے کی یہ ایک مختصر سی تصویر کشی تھی جو میں نے بہ لحاظ پابندیٔ کالم پیش کر دی ہے۔

